پیامِ شہیدان

شہیدانِ کربلا کا پیغام

ڈاکٹر علی قائمی (ایران)

دار الثقافۃ الامامیۃ الاسلامیۃ پاکستان

دار الثقافة الإسلامية
١٤٠٣ھ
كراچی پاکستان

دار الثقافة الإسلامية

١٤٠٣هـ

كراچي باكستان

ACC No...5013...Date.....
Section..... Status .....
D.D. Class..... .....
NAJAFI BOOK LIBRARY

پیامِ شہیدان

شہیدانِ کربلا کا پیغام

تالیف
ڈاکٹر علی قائمی (ایران)

یکے از مطبوعات

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان
۲-جے - ۵/۴ ـــــ ناظم آباد ـــــ نمبر ۲ ـــــ کراچی

نام کتاب : ــــــــــــــــــ پیامِ شہیداں

تالیف : ــــــــــــــــــ ڈاکٹر علی قائمی

مترجم : ــــــــــــــــــ سید حسن امداد ممتاز الافاضل

مدیر : ــــــــــــــــــ سید سعید حیدر زیدی

کتابت : ــــــــــــــــــ سید جعفر صادق

ناشر : ــــــــــــــــــ دارالثقافۃ الاسلامیہ پاکستان

طبع اوّل : ــــــــــــــــــ ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ جولائی ۱۹۹۰ء

تعداد : ــــــــــــــــــ ۲۰۰۰

ترتیب

- مقدمہ ——— ۵
- آج کا دن کون سا دن تھا ——— ۷
- ہم لوگ کون تھے ——— ۱۹
- کچھ اپنے عزاداروں سے ——— ۱۰۳

مقدمہ

عاشور کا دن تمام ہوا ـــــ میدانِ جنگ میں گرد و غبار کا اُٹھتا ہوا طوفان بیٹھ چکا ۔ اِدھر دلیروں کی للکار ، بہادروں کی رجز خوانی ، سرگرم جانبازوں کی صدائیں اور پرجوش و پرمقصد مجاہدین کا اعلان حق ـــــ اور اُدھر ، دنیا پرستوں ، جاہ طلبوں ، ہوا و ہوس کے بندوں اور کرسی و مرتبہ کے خواہشمندوں کے شور و غل اور ان کی خوشی کے شادیانوں کی آوازیں سب کی سب خوابیدہ ہو چکیں۔

اب تو بچّوں کی صدائے العطش بھی کانوں میں نہیں آتی اور نہ حسینؑ مظلوم کی وہ آواز ہی سُنائی دیتی ہے جس کی حق گوئی کو دبانے اور بے اثر بنانے کے لیے دشمن کی طرف سے شور و غل برپا کر دیا جاتا تھا ۔

اب تو ان پُرجرأت ، پرطیش اور پُرحرارت دلیروں کے دلوں

کی حرکت بھی بند ہو چکی ـــــ ان کے گرم گرم جسم ٹھنڈے ہو چکے ۔
وہ خاک پر سو رہے ہیں ـــــــ
اور اس لیے سو رہے ہیں ـــــــ تاکہ بنی اسد
کو موقع مل جائے اور وہ ان کی لاشوں کو تلاش کر کے دفن کر دیں ۔
آہ آہ ! ـــــــ
یہ بے چارے سب کے سب تہِ تیغ ہو چکے ۔ اب کسی
طرف سے کوئی آواز نہیں آتی ۔

آج کا دن کون سا دن تھا

آج کا دن کون سا دن تھا

آج کا دن کشت وخون کا دن تھا ـــــ فریاد وبین کا دن تھا ـــــ شور وشین کا دن تھا ـــــ خوشی کے شادیانوں کا دن تھا ـــــ سوگ وماتم کا دن تھا ـــــ زخموں اور جراحتوں کا دن تھا ـــــ ایک گروہ کی بقا اور دوسرے گروہ کی فنا کا دن تھا ـــــ حق وباطل کے تصادم کا دن تھا ـــــ جہاد کا دن تھا ـــــ اپنا خون بہانے کا دن تھا ـــــ شہادت کا دن تھا۔ اسلام کے اندر حقیقی روح پھونکنے کا دن تھا ـــــ پاک بازوں کی جانبازی کا دن تھا ـــــ دشمنوں کی سفلگی اور پست فطرتی کے اجاگر کرنے کا دن تھا ـــــ قتل کرنے اور قتل ہونے کا دن تھا ـــــ شہادت

کا دن تھا ——— اور ——— اسلام مٹنے سے بچ گیا اس کا جشن منانے کا دن تھا ———!

آج کربلا کا کیا حال ہے

مت پوچھو کہ اب کربلا کا کیا حال ہے۔ سارا میدان اشک آور اور رقت انگیز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خزاں مجسّم ہو کر سامنے آگئی ہے۔

اور ایسی خزاں ———

جو اپنے موسم کے ختم ہونے کے بعد بھی برقرار ہے۔

ظلم کی ہواؤں کا ایک شدید طوفان اُٹھا تھا جس نے، پھولوں، پتّوں کا کیا ذکر، درختوں تک کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا۔ حالانکہ اس سے پہلے یہاں کا منظر سراپا بہار تھا، کھیتیاں سرسبز اور ہری بھری تھیں۔

اب ایک طرف میدان میں شہدا کی لاشیں ہیں جو خوابِ عدم میں ہیں اور جن کے پہلو میں صرف فرشتے ہیں جو گواہی دینے کے لیے موجود ہیں۔

اور دوسری طرف ———

چند نیم سوختہ خیمے ہیں جن سے اب بھی دھواں اُٹھ رہا ہے ———!

یہ وہ شہدا ہیں جن کے جسم پارہ پارہ ہیں۔ بدن زخموں سے چھلنی ہیں۔ یہ سب پیاسے شہید کیے گئے۔ یہ سب کشتۂ تشنگی ہیں۔

مگر ان کا چہرہ اب بھی پُرجلال ہے۔ پیشانی سے شجاعت و جرأت عیاں ہے۔ لبوں پر تبسّم ہے، ابرو پر بل نہیں ——— ہمہ تن خلوص میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

ان پاک بازوں کے افکار و نظریات کا کیا کہنا ،
کسی کی طرف سے دل میں کینہ نہیں ۔ سب عشقِ خدا سے
لب ریز و سرشار ۔
ان کی روح قفسِ جسم کو توڑ کر آزاد ہو چکی ہے ، اور سب کے سب
تمغۂ شہادت اپنے سینوں پر لگائے ہوئے جنت الماویٰ کی سیر کر رہے ہیں ۔
دنیا کے بہادروں میں یہ وہ شجاع اور بہادر لوگ تھے جو اُفقِ
بشریت پر ستاروں کے مانند صرف ایک بار طالع ہوئے اور بہت جلد غروب ہو گئے ۔
یہ باوفا ترین انسان اور آزاد ترین لوگ تھے ۔
ظالموں کے سخت ترین دشمن ـــــــ اور ـــــــ مظلوموں
کے بہترین یاور و مددگار تھے ۔
یہ وہ تشنہ لب تھے جنھوں نے تنہا آبِ حیات نوش کیا ۔
انھوں نے عالم البشریت کو سامان فراہم کرنے کے لیے اپنا سر دے دیا ۔ اپنی
جان دے دی ۔
افسوس کہ ہوا پرست دشمنوں نے صرف جاہ و مال کی خاطر انھیں ،
طرح طرح سے برباد کیا ۔ ان کے جان و مال و لباس کو ـــــــ
طرح طرح سے لوٹا ۔
اور طرح طرح کے جرائم کے مرتکب ہوئے ۔
یہ حرمِ رسولؐ کے پاسدار اور نگہبان اپنے خون کی چادریں اوڑھے
ہوئے سو رہے ہیں ۔ اب ان کا کوئی نگہبان نہیں ۔
دشمنوں نے خیموں میں آگ لگا دی ہے جس کے دھوئیں
سے کربلا کی ساری فضا تاریکی میں ڈوب گئی ہے اور نہ صرف کربلا بلکہ ظلم و جور کا

سارا میدان سیاہ ہو رہا ہے۔ جسے دیکھ کر خود اشقیا شرمسار ہیں اور جس سے خود ان کی رسوائی آشکار ہے۔

بے چاری بیوائیں اور یتیم بچے نہیں جانتے کہ کہاں پناہ لیں اور کسے مدد کے لیے پکاریں۔ کوئی نہیں جو انھیں دشمنوں کے ظلم و ستم سے بچائے۔ اور ان کی آہ و زاری اور فریاد پر ترس کھائے۔

وہ اس سراسیمگی کے عالم میں ——————

کبھی اپنے آقا حسینؑ کو پکارتی ہیں اور کبھی اپنے جد محمد مصطفیٰؐ کو آواز دیتی ہیں —— اور —— کبھی ——————

یا فاطمہؑ —— یا قرۃ عین الرسول کی صدا بلند کرتی ہیں۔ مگر کوئی حاصل نہیں۔ ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے۔ ان کے سارے سامان لوٹے جا رہے ہیں۔

اگر ایک معظمہ ننھے ننھے بچوں کو آگ کی زد سے بچانے کی کوشش کر رہی ہیں تو دوسری آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں داخل ہو کر اپنے بیمار بھتیجے کو اٹھا کر باہر لا رہی ہیں۔ اور تیسری یہ کہہ کر بچوں کو ڈھارس دلا رہی ہیں کہ:

میرے پیارے —— میری جان، ڈرو نہیں۔ یہ کچھ نہیں ہے، ہم بھی تو تمھارے پاس ہیں۔ روؤ نہیں میری جان، میرے پیارے —— نہیں —— نہیں، رویا نہیں کرتے۔

آج کی رات کون سی رات ہے

یہ رات، مصائب و آلام کی سخت ترین رات ہے۔ اور عجیب

رات ہے کہ رسولؐ کے گھرانے کے ننھے ننھے یتیم بچے قتل گاہ میں بکھر گئے ہیں اور دشمنوں کے خوف سے ان میں ہمت و جرأت نہیں کہ اپنے خیموں کی طرف واپس آئیں ——— !!

کچھ بیبیاں ان بھوکے پیاسے بچوں کو سُلانے کی کوشش کر رہی ہیں تاکہ قتل گاہ کا پرہول اور غم انگیز منظر ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے اور ان کی چیخ پکار کچھ کم ہو سکے۔

مگر یہ بچے جو دن بھر کا منظر دیکھے ہوئے ہیں ———

اور اپنے باپ اور بھائیوں کا قتل ان کی نگاہوں میں گھوم رہا ہے۔ بھلا کب چُپ ہوتے ہیں۔

روتے ہیں ——— چیختے ہیں ——— چلّاتے ہیں۔

انھیں نیند کہاں آتی ہے ،

کچھ بے چاری بیبیاں اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں کو یاد کر کے آنسو بہا رہی ہیں۔ نالہ و فریاد کر رہی ہیں۔

کہیں کوئی بہن ہے جو اپنے ماں جائے کی لاش سے لپٹی ہوئی بین کر رہی ہے کہ :

" بھیّا ! میں آپ پر قربان!

آپ کی خون آلود ریش مبارک سے تو اب تک خون ٹپک رہا ہے۔ میری جان آپ پر صد قے ! ہائے ——— !

آپ کو بھوکا پیاسا شہید کر دیا گیا۔ میں آپ کے نچھاور ! "

اور کہیں کوئی ماں اپنے پارۂ جگر کی لاش کے پاس بیٹھی ہوئی آہ و زاری کر رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ :

"میرے لال! کاش تیرا قاتل تیرے ساتھ مجھے بھی قتل کر دیتا
اور میں تجھے اس عالم میں نہ دیکھتی۔"

آج کی شب گریہ وزاری کی شب ہے، نالہ وشیون کی شب ہے۔
ماتم کی شب ہے ——————!

کوئی ماں اس پر رو رہی ہے کہ ——
ہائے میرا شیر خوار بچہ بھی تیر ستم کا نشانہ بنا۔
کوئی ماں اس پر گریہ کناں ہے کہ اس کا نوجوان فرزند اس سے
بچھڑ گیا —— کوئی خاتون اس پر نوحہ کر رہی ہے کہ اس کے عزیزوں کو
اس سے چھین لیا گیا۔ وہ خود شہدار کے درمیان انھیں تلاش کر کے اور ان کی
لاشوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئی ہے۔

کچھ عورتیں اپنے شہید عزیزوں کے سوگ میں بیٹھی ہوئی آنسو بہا
رہی ہیں۔ سینہ زنی کر رہی ہیں۔ اگرچہ یہ سب کی سب نڈھال ہیں، افسردہ ہیں،
اور دل شکستہ ہیں لیکن پھر بھی نخرہ سے ان کا سر اونچا ہے۔

وہ صبر و تحمل کی حدود میں ہیں۔
اور ان کا یہ بین، یہ نوحہ گویا دشت ماریہ میں موت کی
نیند سونے والوں پر اظہار مسرت وشادمانی ہے اور جو لوگ جام شہادت
نوش کر کے خاموش ہیں، ان کے حالات ومصائب کا سب سے پہلا بیان و
برملا تشہیر ہے۔

کوئی دکھیاری، زیر آسمان چاند کی چاندنی میں اپنے پہلو میں تمام
غم واندوہ وافسردگی کو دباتے ہوئے اور ماسوا اللہ کے اپنے دل کو خالی کیے

ہوئے نمازِ شب میں مشغول ہے ——
کوئی آنسو بہائے جاتی ہے، نالہ و فریاد کیے جاتی ہے،
مگر فخر سے اس کا سر اونچا ہے ——
اسے احساسِ سربلندی ہے اور مستقبل کے لیے خاکہ تیار کر رہی ہے اور یہ سوچ رہی ہے کہ،
شہادت کا کام تو انجام دیا جا چکا ——
اب اس کے بعد ——
اس سلسلہ میں ہم لوگوں کو کیا کرنا ہے ——؟
امامِ وقتؑ بیمار ہیں —— اور اتنے شدید بیمار کہ چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ اور آپ کی پھوپھی ——
حضرت زینب علیہا السلام ——
تمام بیواؤں اور یتیموں کی سرپرستی کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ نیز شہیدوں کے پسماندگان کو تسلی و ڈھارس دلاتی ہیں اور انھیں رازِ رمزِ شہادت سے بھی آگاہ کرتی جاتی ہیں۔
اور اس کے ساتھ ساتھ بعد نمازِ شب اپنے مقصد تک پہنچنے کے خاکے اور منصوبے سوچتی جاتی ہیں۔ اور نماز میں اللہ تعالیٰ سے مدد اور توفیق کی طالب ہیں۔

دشمن کی فوج میں کیا ہو رہا ہے

دشمن کی فوج میں بھی کہیں سرگوشیاں ہیں، کہیں سکوت ہے کہیں آپس میں پہیلیاں ہیں اور معمے ہیں۔

مگر یہ کون لوگ ہیں ——— ؟

یہ درحقیقت کمینوں، مکاروں، حیلہ گروں اور پست فطرت لوگوں کا ایک گروہ ہے جو کسی زمانے میں بھی کسی دین پر ایمان نہیں لایا۔ انھیں صرف اپنے مال و منال اور حلوے مانڈے سے کام ہے۔

اور یہ کچھ ہے ———

یہ وہی قوم ہے جس نے ہمیشہ غلامی اور ذلت کی روٹی کھائی اور اسی کو وہ اپنی پُرعیش و عشرت زندگی سمجھتی رہی۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں ———

جو زندہ ہیں اور واقعاً زندہ ہیں۔ مگر دوسروں کو پھاڑ کھانے کے لیے اپنے دانت تیز کرتے رہتے ہیں۔ مگر آج انھیں خطرہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس ظلم کی حکومت کی صبح ہو جائے۔ اور یہ لوگ انتقامِ خونِ حسینؑ لینے والوں اور مختار قسم کے لوگوں کے ہاتھ لگ جائیں۔

کچھ لوگ خوشی کے جشن منا رہے ہیں ———

اس لیے کہ انھوں نے فتح پائی ہے اور اپنے امیرالمومنین یزید کی خاطر انھوں نے حسینؑ اور ان کے اصحاب کو قتل کیا ہے۔

کچھ لوگ اپنے مقتولین کے دفن و کفن میں مصروف ہیں۔

اور ان لوگوں کی نماز جنازہ پڑھ رہے ہیں ——— جو ہمیشہ سے بے نمازی تھے۔

اور کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ———

معلوم ہوتا ہے وہ ابھی ابھی خواب سے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ ہم لوگوں نے یہ کتنا بڑا جرم کیا ———

ہم لوگوں سے یہ کتنا عظیم گناہ سرزد ہوا۔

عاشور کا خطاب ہر دَور کے لوگوں کے لیے ہے

بظاہر دیکھنے میں تو میدانِ کربلا میں اب کوئی جنگ نہیں ہو رہی ہے اور نہ ایسی کوئی آواز ہی سُنائی دیتی ہے۔ لیکن ذرا کان دھر کر غور سے سُنا جائے تو ان شہیدوں کی آواز تاریخ کی فضاؤں میں گونجتی ہوئی اپنے بعد کی نسلوں اور آئندہ آنے والوں کو ہوشیار اور بیدار کرتی ہوئی آج بھی ہمارے کانوں تک پہنچ رہی ہے ——

جو آواز روح اور روح کی گہرائیوں سے نکلتی ہے ——

وہ ٹھیک ٹھیک آکر ——

دل میں بیٹھ جاتی ہے۔

چنانچہ آج بھی حسینؑ شہید کی صدائے هَلْ مِنْ نَاصِرٍ ہمارے کانوں تک پہنچ رہی ہے۔

آج بھی آپ کے گلوئے خشک سے اَنَا قَتِیْلُ العِبْرَۃ کی آواز نکل رہی ہے ——

آج بھی آپ کی اس دن کی گفتگو میں —— آپ کی رجز خوانیاں آپ کے موعظے —— اور —— آپؑ کے خطبات، لوگوں کے کانوں میں گونج رہے ہیں اور تمام عالم سے تقاضا کرتے ہیں کہ ——

لوگ اس کو غور سے سنیں، سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔

اگر محسوس کیا جائے تو حسینؑ شہید آج بھی میدان میں یکہ و تنہا ہیں اور ایک گروہ جو بظاہر زندہ لیکن دل مردہ ہے ان کے مدمقابل ہے۔

اور آپ کے کلام کو کان دھر کر سننے کے بجائے شور وغل مچا رہا ہے تاکہ اس میں آپ کی آواز دب کر رہ جائے اور کوئی سُن نہ سکے۔

میدانِ کربلا سے آج بھی حسینؑ مظلوم کی فریاد بلند ہو رہی ہے۔ اور صاحبانِ نظر اور حق بینوں کے کانوں میں ان کی آواز گونج رہی
اور انھیں دعوتِ حق دے رہی ہے۔

مگر اب ———،

امامؑ مظلوم کا خطاب نہ شمر بن ذی الجوشن سے ہے،
نہ سنان بن انس سے ———،
اور نہ عمر بن سعد سے —

اس لیے ———،

کہ یہ لوگ تاریخ کی تاریک قبروں میں مدت ہوئی دفن ہو کر سڑ گل چکے۔
اور نہ آپ کا خطاب یزید کی فوج سے ہے ———
نہ ابن زیاد سے ہے۔

اس لیے ———،

کہ یہ سب بھی فنا کے منہ میں گئے اور آتشِ یاس و حرمان میں جل کر راکھ ہو چکے۔

اب آپ کا خطاب، ہمارے زمانے کے بہت سے شمروں، سنانوں اور عمروں سے ہے۔ اور ان لوگوں سے ہے جو ———،
۶۱ھ کے آدمیوں کی طرح کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں
اور کوئی بعید نہیں جو ان کے دل میں یہ ہو کہ وہ بھی کوئی پتھر اٹھا کر حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ کی طرف پھینک ماریں۔

بلکہ آج آپ کا خطاب ———
تمام انسانوں سے ہے ۔

ان انسانوں سے جو دنیا کے مختلف گوشوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان سب کو نیکی کی طرف ہدایت ، اپنی باعزت و باشرافت زندگی کی نگہبانی اور اپنی خودداری کے تحفظ کی دعوت دے رہے ہیں ۔

لہٰذا اب یہ سمجھو کہ ———

تم جہاں ہو وہیں کربلا ہے اور تمھارے لیے ہر روز روزِ عاشورا ہے ۔ اور حسینؑ مظلوم اس میں تنہا کھڑے ہوئے تم سب کو خطاب کر رہے ہیں ۔ تمھیں ہدایت دے رہے ہیں ،

اور دیگر شہدا ر ستاروں کی مانند ———

ان کے گرد و پیش اپنے مختصر سے گروہ کے ساتھ اب بھی لبیک کہہ رہے ہیں ۔ ان لوگوں نے اپنے رہبر حسین شہیدؑ کے ساتھ رہ کر ایسی تنظیم ، ایسی بہادری ، حق پرستی اور انسانیت پیش کی کہ ———

اس تنظیم و یک جہتی کا پوری تاریخ انسانیت میں کہیں سراغ نہیں ملتا ۔ ان شہدا ر نے انقلاب و جہاد کی دنیا میں ایک ایسی درس گاہ کھولی کہ اس جیسی اثر و نفوذ رکھنے والی درس گاہ اہل عالم کے حافظہ میں نہیں ہے ۔

ان لوگوں نے اپنی درس گاہ کے لیے گویا ایک وزیٹر بک بھی رکھ دی چنانچہ اس وقت سے آج تک جو دیکھنے والا اس درس گاہ کو دیکھتا ہے وہ اپنے تاثرات اس وزیٹر بک پر لکھ دیتا ، اس کی بنیاد ، اس کے لائحۂ عمل اس کی تنظیم اور اس کی تلاش و جستجو کو سراہتا ہے ۔

پھر اس وزیٹر بک کے ابتدائی صفحات میں ان شہدار نے اپنا تعارف بھی کرایا ہے اور اپنے اغراض و مقاصد اور اپنے لائحہ عمل کو بھی پیش کر دیا اور یہ بھی لکھ دیا کہ ان اغراض و مقاصد کے حصول کی صورت کیا ہے جو ہمیشہ کے لیے تاریخ کے سینے میں محفوظ ہے۔

آج اہلبیتؑ کے لیے بچھڑے ہوئے عزیزوں کے سوگ کی شب ہے۔
آج شامِ غریباں ہے۔
آج گیارہ محرم ۶۱ھ کی تاسی میں یہ مجلس بھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہے اور یہاں شہدار کربلا کے پسماندگان کے پریشان ماحول سے مشابہ ماحول تیار کیا گیا ہے۔ چاہتے ہیں کہ ان کی اس وزیٹر بک کے ابتدائی صفحات جس میں خود ان کی کہانی انہی کی زبانی ہے پڑھ کر سنائیں۔

ہم لوگ کون تھے

ہم لوگ کون تھے

ہمارا ایک گروہ تھا۔ جس میں اتحاد تھا ــــــــ
انتشار نہ تھا۔
سب ہم خیال تھے، ان میں کوئی اختلاف رائے نہ تھی۔
اپنے سامنے ایک مقصد رکھتے تھے۔ ایک خاکہ تھا ــــ اور ــــ ایک
لائحۂ عمل تھا اور پورے نپے تلے انداز سے تھا۔
ہم چند سر باز اور چند سپاہی تھے ــــــــــ
مختلف خطّوں کے، مختلف رنگ و نسل کے، مختلف
سن و سال کے۔
ہم لوگوں میں قدر مشترک صرف ایک جذبۂ عشق و ایمان تھا۔

صرف جوشِ حق اور فداکاری کی امنگ تھی اور اس کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

ہم چند سپاہی تھے ——

جن میں کچھ بوڑھے تھے، کچھ جوان، کچھ خورد سال اور کچھ درمیانہ سال کے جو ایک ہی مقصد تک پہنچنے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔

بلکہ یوں کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ،

اپنے کھوئے ہوئے مقصد کو پھر سے حاصل کرنے کا عہد کیے ہوئے تھے ——

اور یہ عہد کیے ہوئے تھے کہ ——

جب تک جان میں جان ہے، احقاقِ حق کے لیے ثابت قدم رہیں گے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اپنا خون تک بہا دیں گے۔

ہمارے گروہ میں چند نوجوان بھی تھے ——

جن کے چہرے بتاتے تھے کہ عنفوانِ شباب ہے،

ابھی پورے جوان نہیں ہیں۔

چند بچے تھے ——

بن کھلے پھولوں اور ناشگفتہ غنچوں کے مانند، جو لذتِ آب و غذا و لہو و لعب کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ ہو لیے تھے۔

کچھ حبشی تھے —— جن کی جلد سیاہ تھی۔

کچھ بھوکے پیاسے بوڑھے غلام —— کچھ سخت اور مضبوط ہاتھ پاؤں والے کسان، زراعت پیشہ، کچھ ایسے کہ دوپہر کی دھوپ میں کام کرتے کرتے جن کے چہرے جھلسے ہوئے تھے۔

مگر سب کا مقصد ایک تھا، سب کی آرزو ایک تھی۔

ہم لوگوں کے دل میں بھی خواہشات تھیں اور ہم بے سروسامان نہ تھے

ہمارے افراد کے دل میں بھی جینے کی خواہش تھی۔ وہ اپنی زندگی سے دل برداشتہ اور عاجز نہ تھے۔

رنج وغم و مصائب و آلام سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے جان دینا یا خودکشی کرنا نہیں چاہتے تھے۔

ہم لوگ بھی تم ہی جیسے انسان تھے اور جلبِ منفعت اور دفعِ ضرر کا جذبہ رکھتے تھے، زندہ رہنا چاہتے تھے اور آرام و آسائش کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے تھے۔

مگر ایک ایسی ضرورت پیش آئی ــــــــــ

کہ جس کے لیے ہم لوگوں نے اپنی ہر شے کو خیرباد کہا۔ اور اپنی ہر اہم سے اہم شے کو بھی نظرانداز کر دیا۔

ہمارے افراد بے سروپاؤں کے نہ تھے۔

خدا کے فضل سے ان کا نام تھا ــــــــــ نشان تھا ــــــــــ کنبہ تھا ــــــــــ قبیلہ تھا ــــــــــ بلکہ ان میں سے بعض تو بہت خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

اور اگر چاہتے تو ــــــــــ

بہت اچھی طرح اپنی زندگی کی حفاظت کر سکتے تھے۔

ہمارے افراد بے سروسامان اور خانہ بدوش نہ تھے۔ بحمداللہ اپنا گھر تھا ــــــــــ گھونسلہ تھا ــــــــــ کاروبار تھا ــــــــــ رتبہ تھا، عہدہ تھا۔

بیوی بچے تھے ـــــ کلیجے کے ٹکڑے تھے ـــــ دوست احباب تھے
دیگر متعلقین تھے، جنھیں ہم لوگوں سے محبت تھی اور ہمیں ان لوگوں سے۔
ہم میں سے کچھ نوجوان تو ایسے تھے جو اپنے پہلو میں سینکڑوں
تمنائیں رکھتے تھے۔
کچھ بوڑھے تھے اور ایسے تھے کہ اب انھیں آرام کرنا چاہیے تھا۔
کچھ بچے تھے۔ جو اس قابل تھے کہ کسی مکتب میں بیٹھ کر علم حاصل کریں یا گلی
کوچوں میں کھیلیں کودیں۔
لیکن اپنے مقدس مقصد کے لیے ـــــــــــ
اور پیارے دین اسلام کی زندگی بچانے کے لیے ہم لوگ
ان تمام چیزوں سے دست کش ہو گئے، ہم نے اپنی تمام خواہشات کو تج دیا، اپنی
زندگی کے سارے سازوسامان کو نظر انداز کر دیا۔
اگر ہم لوگ بھی اس مقدس مقصد سے چشم پوشی کرتے ـــــ،
اگر ہم لوگ بھی دوسروں کی طرح خاموش رہتے،
تو ـــــــــــ
ہماری ہر شے بچ جاتی۔
گھر مکان بھی ـــــ زندگی بھی ـــــ زن و فرزند بھی،
اور عیش و آسائش کے سارے سازوسامان بھی۔
ہمارے بچے یتیم نہ ہوتے ـــــــــــ
ہماری عورتیں بیوہ نہ ہوتیں ـــــــــــ لیکن ہم لوگوں
نے چاہا کہ ایسا نہ کریں کہ اپنے مطلب کو دیکھیں ـــــــــــ
اور انسانیت کو نظر انداز کر دیں !!!

ہم جان دینے پر کیوں آمادہ ہوئے

دنیا میں ہر حادثہ اور ہر واقعہ کے لیے، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا کچھ نہ کچھ اسباب ہوتے ہیں۔ بعض اسباب ظاہر و آشکار ہوتے ہیں ——،
جو نظر آتے ہیں۔
اور بعض پوشیدہ ہوتے ہیں ——،
جو نظر نہیں آتے ——

کربلا کا واقعہ اور عاشور کا خونیں حادثہ بھی ان دونوں طرح کے اسباب سے خالی نہیں۔ کربلا کے واقعہ کے ظاہری اسباب کچھ اور ہیں ——،
اور باطنی اسباب کچھ اور۔

ظاہری سبب تو یہ تھا کہ معاویہ نے معاہدہ کے خلاف کیا اور یزید نے حسینؑ اور ان کے دوستوں سے بیعت طلب کی، اس کا ظلم، اس کی تباہ کاری جس سے اسلام کی عزت و آبرو کو خطرہ تھا اور امت تباہ و برباد ہو رہی تھی۔
لیکن ——
اس ظاہری سبب کے پیچھے ایک باطنی سبب بھی تھا اور وہ یہ کہ قبائلی، خاندانی اور نسلی تعصب پھر سے زندہ ہو گیا تھا کہ جس کو مٹانے کے لیے اسلام نے برسوں کوشش کی تھی۔

حضرت علی علیہ السلام اسی تعصب کے شکار ہوئے اور انھیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

ہم لوگوں کے انقلاب کو محض سطحی طور پر نہیں بلکہ اس زمانے معاشرہ اور حکومتِ وقت کی وضع قطع کے درمیان رکھ کر دیکھنا چاہیے۔

یہ وہ دور تھا ـــــــ
جس میں لوگوں کے باز پرس پر کوئی اعتنا نہ کی جاتی تھی ہم لوگ وضاحتیں طلب کرتے تھے اور اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا تھا۔ اس کے نتیجے میں ایسا ماحول پیدا ہو گیا تھا کہ جس میں شجرہ اسلام ہی خشک ہوا چاہتا تھا ـــــــــــــ'

اور کم از کم ہم لوگ تو باوجودیکہ چند ہی نفر تھے مگر اس صورت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

اس قیام اور اٹھ کھڑے ہونے کا منشا اور سبب

کربلا کا واقعہ کوئی ایسا حادثہ نہ تھا جو بلا سبب، اتفاقیہ اور ناگہانی طور پر یک بیک رونما ہو گیا ہو اور پھر جلد ہی ختم ہو جائے۔

بلکہ جب اس کی ضرورت ہوئی تو یہ خود پیدا ہوا۔

اور اس کے پیدا ہونے کے بہت سے علل واسباب تھے جو یکے بعد دیگرے سامنے آتے رہے۔ اور ایک سبب دوسرے سبب کے لیے علت قرار پاتا رہا۔

ان امور کے اسباب کی تحقیق اس وقت سے کرنا چاہیے جب بنی امیہ اور بنی ہاشم یہ دو گروہ وجود میں آئے اور ان دونوں میں الجھاؤ اور اختلاف پیدا ہوا۔

اور جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان امور کو اس وقت سے دیکھے:

بنی امیّہ کون تھے اور انھوں نے کیا کیا

ہاشم اور امیہ دو[۲] بھائی تھے۔

پیدائش کے وقت ہاشم کے پاؤں کا انگوٹھا امیّہ کی پیشانی سے چسپیدہ تھا۔ جو تلوار سے کاٹ کر جدا کیا گیا۔

اور اس کے بعد دونوں نے الگ الگ پرورش پائی، اور بڑے ہوئے _____

مگر _____

چونکہ ہاشم کی اولاد کو سرداری اور سیادت ملی اور امیہ کی اولاد اس سے محروم رہی، اس لیے ان دونوں کی اولادوں میں زندگی بھر بغض و حسد و کینہ کی آگ سلگتی رہی۔

اور پھر یہ دائمی شکل اختیار کر گئی۔

اور بعد میں تو اس کے اندر پوری شدت پیدا ہو گئی اور کھلم کھلا دشمنی کی نوبت آگئی۔ ان دونوں میں سے جس کو جب موقع ملا اس نے دوسرے پر حملہ کر دیا اور اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔

مگر چونکہ بنی امیہ نیکی و شرافت، سرپرستی و سرداری میں بنی ہاشم سے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے وہ ان سے دل گرفتہ تھے اور ہمیشہ ان سے لڑتے جھگڑتے رہتے۔

بنی امیّہ زمانۂ حیاتِ پیغمبر میں

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے جو ہاشم کی

اولاد تھے، بنی امیّہ کا بغض وکینہ اور بڑھ گیا اور انھیں اپنی کمتری اور حقارت کا احساس اور زیادہ ہوگیا۔

اور اس حد تک ہوا کہ ——

وہ جنگ و پیکار کے لیے تیار ہوگئے۔ اور چاہتے تھے کہ آنحضرتؐ کے کام کو آگے نہ بڑھنے دیں اور اسے ختم کردیں۔

آنحضرتؐ کی مکی زندگی تک یہ لوگ آپؐ کے کام میں روڑے اٹکاتے رہے اور مخالفت سے باز نہ آئے۔

ابوسفیان جو مشرکین کا سردار تھا اور اس کے بیٹے معاویہ دونوں نے کوشش کی کہ آنحضرتؐ کی تبلیغ کو بے اثر بنادیں اور آپؐ کے متبعین کو ستائیں اور آزار پہنچائیں۔

جس کے نتیجہ میں کچھ مومنین کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی اور جو رہ گئے اور ہجرت نہ کرسکے انھیں پھانسی، قتل اور طرح طرح کی سزائیں جھیلنی پڑیں۔

اور جب پیغمبرؐ نے بھی ان کے مظالم سے تنگ آکر مکہ سے ہجرت اختیار کرلی تب بھی باز نہ آئے —— آپ کو ستاتے ہی رہے —— آپؐ پر فوج کشی اور لشکر کشی کرتے رہے۔ اور اس سلسلہ میں انھوں نے مسلمانوں کی کتنی جانیں تلف کیں —— انھیں کتنا مالی نقصان پہنچایا اور اسلام کی اشاعت و تبلیغ کی راہ میں کیسی کیسی رکاوٹیں کھڑی کیں۔

اسی کش مکش میں بعثت پیغمبرؐ کو بیس سال کا عرصہ گزر گیا مگر وہ ابھی تک ایمان نہیں لائے۔

بالآخر ہجرت کے آٹھویں سال فتحِ مکّہ کے موقع پر یہ لوگ مسلمان ہوئے۔ اور مصلحتاً ایمان لائے۔

صرف اپنے جان و مال کی حفاظت کے لیے ——————

—————— اور صرف اس لالچ میں کہ شاید ہمیں بھی اسلام سے بنی ہوئی کوئی ٹوپی سر پر رکھنے کے لیے مل جائے۔ یا اس لیے کہ اسلام کے زیرِ سایہ رہ کر زور پکڑیں اور اندر ہی اندر ہم مسلمانوں پر حملہ آور ہوں۔

بنی امیہ، اسلام کا نام لے کر اور خود کو مسلمان کہلا کر ہمارے گھروں میں داخل ہوئے اور انھوں نے اندر ہی اندر دشمنی شروع کر دی۔

اور دشمنی کا خطرناک ترین راستہ یعنی نفاق اختیار کیا۔

نفاق میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے باوجودیکہ آپؐ بڑے حلیم اور بردبار تھے، بڑے شفیق و مہربان اور رحیم تھے مگر اتنے تنگ آئے کہ کئی بار آپ نے بنی امیہ کے سردار ابوسفیان اور اس کے بیٹے معاویہ پر لعنت بھیجی۔

بنی امیّہ خلفا کے عہد میں

حضرات خلفاء ثلاثہ جنھوں نے سب سے پہلے اسلام میں جدتوں کی بنیاد ڈالی، ان کے پیشِ نظر صرف اپنی حکومت کا بچانا اور اپنے شخصی مفاد کی حفاظت تھی۔ پھر وہ کیونکر عامۃ المسلمین کے مفاد کا خیال رکھ سکتے تھے۔

پیغمبرِ اسلامؐ نے وقتِ رحلت ——————؟

ہم اہلِ اسلام کو قرآن اور عترت کے حوالے کیا تھا۔ اور اہل اسلام کو حکم دیا تھا کہ:

تم لوگ حبل متین یعنی ولائے عترت سے متمسک رہنا۔

مگر ان حضرات نے سرتابی کا راستہ اختیار کیا ——— غلط پروپیگنڈے کیے اور حضرت علیؑ کو خلافت وحکومت مسلمین سے دور رکھ کر اسلام کا شیرازہ بکھیر دیا۔

بنی امیہ جو مصلحتاً اسلام لانے والوں میں سے تھے۔ وہ گروہ بندی اور جتھہ بازی کی فکر میں لگ گئے۔

اور پیغمبر اسلامؐ کی رحلت پر ———

جب تمام لوگ سوگ میں تھے، ان لوگوں کو بہت اچھا موقع مل گیا۔ اور ایسا موقع ملا کہ اس سے انھوں نے جاہ طلبی کا فائدہ اٹھایا۔

اپنی ساری کوششیں اپنے جاہ ومنصب کے استحکام کے لیے صرف کیں اور چند نادان یا دانا وحیلہ گر صحابیوں کی مدد سے پیغمبرؐ اور ان کے خاندان کے خلاف شورش برپا کی اور علی ابن ابی طالب کو جو اسلام کے تنہا نمونہ تھے شکست دینے کے لیے باہم تعاون کرنے لگے۔

ان لوگوں نے ہمیشہ اپنی فکر کی ———

اسلام کی نہیں؛

اپنا بھلا چاہا ——— لوگوں کا نہیں۔

حصول جاہ ومنصب کے لیے ناچتے پھرے، بظاہر ہمدردیاں دکھائیں اور ساتھ دینے کی خود آکر پیش کش کی۔ مگر اس کے باوجود انھوں نے بھی دوسرے دشمنوں کی طرح ——— آلِ محمدؐ کے فضل وشرف، ان کے مقامِ علمی، ان کے تقویٰ کو نظر انداز کیا اور حضرت علیؑ پر، جوانی اور ناتجربہ کاری کا الزام لگانے میں ان کے ہمنوا ہو گئے۔

بنی امیّہ کو سب سے پہلی اور کھلی ہوئی کامیابی حضرت عمر کے دور میں ہوئی اور وہ یہ کہ ——— اس دور میں معاویہ کو حاکمِ شام بنا کر بھیج دیا گیا ——— جس نے وہاں پہنچ کر خود کو مستحکم اور اسلام کو ضعیف و کمزور بنایا۔

پھر عہدِ عثمان میں حکومت کی غفلت اور تسامُح سے معاویہ کو اپنی کارستانیوں کے لیے میدان اور وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔ اور وہ بھی اس حد تک کہ گویا وہ بالکل مطلق العنان ہے۔ جو چاہے کرے۔ اس سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں۔ اس خطے کے پورے پورے اختیارات اس کو حاصل ہیں۔ اس نے اس دور دراز خطے میں ———

اپنے امر و نہی ——— ترغیب و تحدید کو آزادی کے ساتھ نافذ کیا۔ خود اپنا بنایا ہوا اسلام جاری کیا اور خود اپنی پسند کے دین کی طرف عوام کو دعوت دی۔

بنی امیہ، معاویہ کی اس تقرری پر بہت خوش ہوئے اور آہستہ آہستہ وہاں جمع ہونے اور اپنے قدم جمانے کی کوشش کرنے لگے۔ وہاں بڑی بڑی جاگیریں حاصل کیں اور دوسرے مقامی باشندوں کے حقوق غصب کیے۔

بنی امیّہ حضرت علیؑ اور فرزندانِ علیؑ کے دَور میں

جس روز امت نے حضرت علیؑ کو باصرار تمام دوبارہ مسندِ خلافت پر بٹھایا ———

دشمنوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اب ہمارا جینا ممکن نہیں۔

لہٰذا پوری قوت سے اس کام میں لگ گئے کہ حضرت علیؑ کی حکومت کو کمزور اور ان سے اقتدار کو سلب کرلیں۔

اس سلسلہ میں دشمنوں نے وہ کون سا کام تھا جو نہیں کیا،

کون سا فتنہ تھا جو نہیں اٹھایا ——————

وہ کون سی عیاری اور چالبازی تھی جو نہیں کی۔

انھیں لوگوں نے معاویہ کے زیر سایہ رہ کر قتل عثمان کی بنیاد ڈالی۔

اور حضرت عائشہ کے اشارہ پر قتل عثمان میں شریک ہوئے۔ مگر اتہام یہ لگایا کہ عثمان کو علیؑ نے قتل کرایا ہے۔

اور پھر ان کے خون آلود پیراہن کو ذریعہ بنا کر لوگوں کے ذہن و فکر کو ماؤف کر دیا اور بالآخر خاندان رسالت سے برسر پیکار ہو گئے۔

ان لوگوں نے اصحاب پیغمبرؐ کو حضرت علیؑ سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے طرح طرح سے دانے ڈالے اور حد یہ ہے کہ حضرت علیؑ کے بھائی تک کو ان سے جدا کر دیا اور انھیں اپنی طرف کھینچ لیا ——————

پھر ان سے جنگ کا راستہ اختیار کیا ——————

ان کے خلاف لوگوں کو ابھارا —————— ان کے خلاف پروپیگنڈے کیے، ان کو ملحد اور کافر تک کہنے لگے۔

پھر حضرت علیؑ کو اس حکمین کے قبول کرنے پر مجبور کیا جس میں ایک عمر عاص ہو اور دوسرا ابو موسیٰ اشعری۔

اس کے بعد حضرت علیؑ مجبور ہوئے کہ اہلِ نہروان سے جنگ کریں۔ اور بادل نخواستہ ان کا خون بہائیں۔ وہ لوگ بظاہر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے مگر اس کے برعکس عمل کرتے تھے۔ معاویہ کی فریب کاریوں ہی نے اہل نہروان کو

یہ دن دکھائے۔

حضرت علیؑ شہید عدل وفضل، مسجدِ کوفہ کی محرابِ عبادت میں قتل ہوئے اور ان کے فرزندِ رشید حضرت امام حسنؑ اپنے باپ کی جگہ مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ ——

خلافتِ رسولؐ کے لیے جس روز اجماع کی بحث چھڑی تھی معاویہ اجماع کی تائید وہمنوائی کر رہا تھا،

لیکن جب یہی اجماع حضرت حسن ابن علیؑ کے لیے ہوا تو عراق پر لشکر کشی کر دی اور اجماع کی مخالفت پر اتر آیا۔

امام حسنؑ نے محض اس لیے کہ امت میں فتنہ برپا نہ ہو اور مسلمانوں کا خون ناحق نہ بہے ——

اور اس لیے بھی کہ حکومتِ روم مسلمانوں پر حملہ کر کے ان کی طاقت کو کمزور نہ کر دے ——

اور اس لیے بھی کہ ہمارے وہ شیعہ جو منجانب محمدؐ میراثِ انبیاء کے حامل ہیں اور منجانب رسولؐ وعلی ابن ابی طالبؑ میراثِ احادیث کے حامل ہیں کہیں تلف نہ ہو جائیں ——

اور اس لیے بھی کہ بشریت بغیر علم وتفسیر کے نہیں رہ سکتی۔

اس لیے بھی کہ احکامِ اسلام کے بیان اور اس کی وضاحت میں تنگی نہ واقع ہو جائے ——

اور اس لیے بھی کہ امام حسنؑ کا کوئی مددگار بھی نہ تھا۔ اور عبیداللہ ابن عباس جیسا شخص معاویہ کی دختر سے شادی کے لالچ میں اپنے پورے

فوجی دستے کو ادھر سے اٹھا کر لے گیا اور معاویہ کی فوج میں شامل ہو گیا۔
امام حسنؑ نے صبر اور صبرِ تلخ فرمایا۔
بالکل اسی طرح، جس طرح آپؑ کے پدرِ عالی مقامؑ نے
فرمایا تھا ——————
یعنی اس شخص کے مانند صبر، جس کے گلے میں ہڈی اٹکی
ہوئی ہو اور آنکھ میں کانٹا چبھ گیا ہو۔
امام حسنؑ بھی چند سال میں معاویہ کی سازش سے اپنی زوجہ کے
ہاتھوں زہر سے شہید ہو گئے۔ اور دنیا سے رخصت ہوئے۔
اور اب آپ کے برادرِ رشید حضرت امام حسینؑ شیعوں کے
رہبر قرار پائے۔ اور آپؑ نے بھی اسی طرح صبرِ تلخ و جانفرسا قبول فرمایا۔
معاویہ کی بدعہدی، یزید کی ولیعہدی اور دین و اولیائے دین کی
جانب سے بے اعتنائی، ان سب باتوں نے مل کر اختلاف پیدا کر دیا اور یزید
کی حرکتوں نے اس اختلاف کو بالآخر کھول کر سامنے رکھ دیا۔

بنی امیّہ کی خیانت اور بد دیانتیاں

اب تک جو کچھ بیان ہو چکا وہ اسلام و مسلمین کے ساتھ بنی امیّہ
کی خیانت و بد دیانتی ہی کی جھلکیاں تھیں۔ ان کے علاوہ ان کی مزید خیانتیں
بھی کم اہم نہیں اور وہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں۔
ان میں سب سے اہم بات حکومت کو اسلامی طرز و شکل سے
خارج کر دینا تھا ——————؛
معاویہ نے حصولِ اقتدار کے لیے جوڑ توڑ، فریب کاری

اور جنگ سے کام لیا اور اپنے عہدے ، اپنی شان و شوکت اور پیسے کے زور پر خلیفہ بنا ——————

مگر یہ کس کا خلیفہ تھا ——————؟

کیا رسولِ اسلامؐ کا خلیفہ تھا ——————؟

ہرگز نہیں ——————!

شیطان کا خلیفہ و نائب تھا۔

کیونکہ ہر خلیفہ و نائب اپنے منیب کے سیرت و کردار کی کچھ نہ کچھ جھلک رکھتا ہے اور اس میں پیغمبر کے سیرت و کردار کی کونسی جھلک تھی؟

اس نے اقتدار اور خلافت کے بل بوتے پر، ایامِ جاہلیت کی سنّت پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کی اور اسلامی حکومت کو خاندانی حکومت میں تبدیل کر دیا۔

لوگ جو آزادی اور ہر قید و بند سے رہائی پا چکے تھے اس نے انھیں دوبارہ غلامی کی رسّی میں جکڑا۔ اس نے حکومت کو صرف اشراف اور اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔

اور خاص کر وہ جنھیں عشرہ مبشرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، خوب نوازا —— جاگیریں دیں —— مِلک و املاک دیے —— اور اتنے دیے کہ ان لوگوں نے اپنے مرنے کے بعد بہت سے غلام، ملک و املاک اور بے شمار درہم و دینار ترکے میں چھوڑے۔ جبکہ اس وقت ہزاروں انسان فاقہ کشی میں مبتلا تھے —— بے پناہ تھے —— بے گھر تھے۔

نیز اسلامی فوج کے شہداء کے ہزاروں پسماندگان، انتہائی فقر و فاقہ اور تنگدستی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اتنا تو چاہیے تھا کہ انھیں انتہائی معمولی

ہی زندگی بسر کرنے کا سامان کر دیا جاتا۔

ان کی حیاتِ دنیاوی کی کامیابی

ان اشراف لوگوں نے معاویہ کی زیرِ سرپرستی و قیادت میں اپنی زندگی کو خوشحال اور کامیاب بنانے اور حصول اقتدار و سلطنت کے لیے بُرے سے بُرے عمل کو بھی نہیں چھوڑا۔

ان لوگوں نے اپنے نفرت انگیز مقصد کے لیے جس طرح اقتدار پر قبضہ کیا وہ تبلیغ اور پروپیگنڈے کی ایک بزدلانہ کوشش تھی۔

یہ لوگ آلِ محمدؐ سے عوام کو دور رکھنا اور لوگوں کے درمیان تفرقہ و نفاق پھیلانا چاہتے تھے کہ پانی گدلا کر کے اس میں سے مچھلی پکڑیں۔

یہ لوگ حضرت علیؑ کو جو اسلام کے دست و بازو تھے اور مالک بن اشتر کو جو حضرت علیؑ کے دست و بازو تھے، ملحد اور کافر کہتے اور سالہا سال تک اپنی نمازوں اور دعاؤں میں ان پر سبّ و لعن کیا کرتے۔ اور حضرت علیؑ کے متبعین کو چور اور رہزن مشہور کرتے۔

حضرت حسن ابن علیؑ پر عیاشی اور عورت کے رسیا ہونے کی تہمت رکھتے۔ ان پر بہت سے افترا اور بہتان لگاتے اور ان کی بدگوئیاں کرتے پھرتے۔

اور دوسری کوشش بنی امیہ کے فضائل میں جعلی اور مصنوعی احادیث و روایات کے ذریعہ کی گئی۔ اس سلسلہ میں کتنے ابوہریراؤں سے کام لیا گیا اور انھوں نے کیسی کیسی رسوا کن احادیث وضع کیں اور لوگوں کے افکار و خیالات کو بے حس و حرکت اور مفلوج بنا دیا۔ اور خاندان رسولؐ کی ضد و مخالفت

کے کیا کیا طریقے نہیں اختیار کیے گئے۔

شاعروں نے بھی اس سلسلے میں بد دیانتی کرنے میں کسر نہیں اٹھا رکھی ابو ہریراؤں نے اپنی خباثت اور گندگی کا خوب خوب اظہار کیا۔ اور اتنا کہ جس کا کوئی شمار نہیں۔

انھوں نے اسلامی تعلیمات کو غیر اسلامی باتوں سے مخلوط کیا اور اسے خالص اسلام کا نام دیکر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

لیکن ہمارے وہ بزرگان اسلام جنھوں نے اسلام کے لیے جنگ و جہاد کیا تھا، اپنا خون بہایا تھا۔ اپنا مال، اپنے فرزند، اپنے بھائی باپ سب کو اسلام پر قربان کر دیا تھا، ہر طرح کی قربانیاں دی تھیں! انھوں نے اس رویہ پر اعتراض کیا مگر اس پر کوئی اعتنا نہ کی گئی ——

اور پھر جب اعتراض ذرا سخت لہجہ میں کیا گیا ——

تو ——

ان لوگوں نے ہمارے بزرگوں میں سے کسی کو مارا کسی کو قتل کیا اور کسی کو شہر بدر کر دیا۔

چنانچہ حضرت ابوذر کو پیٹا گیا۔ انھیں شہر بدر کر کے مقام زبدہ بھیج دیا گیا۔ اور انھوں نے وہیں بھوکے پیاسے اور کس مپرسی کے عالم میں وفات پائی۔

حجر بن عدی کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں باندھ کر قتل کیا گیا اور انھیں اس قبر میں جس کو ان کے لیے اور خود ان کی آنکھوں کے سامنے کھودا گیا تھا دفن کیا۔

اس کے علاوہ اور بہت سے لوگوں کو زمین کھود کر زندہ دفن کر دیا گیا مگر اس کے باوجود ہم میں سے بہت سے لوگ ابھی مزید قربانی دینے کے لیے تیار تھے۔ اور دشمن اپنے کام میں مصروف تھے۔ مگر اس ظلم و ستم کے باوجود ان کا کام نہیں چلا اور لوگوں کی زبانیں بند نہ ہوئیں۔

اب کچھ کچھ بنی امیہ کے عمل میں شرک کی جھلک نمودار ہو رہی تھی۔

مگر چونکہ وہ اپنے نام پر اسلام کا لیبل لگائے ہوئے تھے اس لیے ان کی ساری بداعمالیوں کو ان کے محاسن اور فضائل میں شمار کیا جانے لگا۔ نتیجہ میں اسلام اور اسلامی اخلاق پھر سے ان چند ریاکاروں، فریب کاروں اور مفاد پرستوں کے چنگل میں ایسا گرفتار ہوا کہ جس سے رہائی اور آزادی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

حضرت سید الشہدا امام حسینؑ کا دور

جہاں تک ہم لوگوں نے دیکھا یہی پایا کہ عوام کی زندگی یوں بسر ہو رہی تھی کہ ہر طرف وحشت و بربریت، گلوگیری و اضطراب کا دور دورہ تھا۔

اعتراض کرنے والوں اور مخالفت کرنے والوں کی تازیانوں یا چھڑی سے خبر لی جاتی۔ غربا اور مفلس بے چارے دم نہیں مار سکتے تھے، رعب و ہیبت نے لوگوں سے حق گوئی کی طاقت سلب کر لی تھی۔

اس دور میں قوم کے اندر نہ اسلام کی دی ہوئی آزادی تھی نہ انسانیت، نہ مروت نہ عطوفت۔ نہ ان کی اقتصادیات کی درستی کا سامان نہ اسلامی خطوط پر چلنے والی سیاست۔ لوگ فاقہ کشی میں مبتلا، شیوہ کسمپرسی

اور پستی کے عالم میں۔ نہ ان کے پاس گھر نہ بار، نہ ان کے لیے ردا نہ غذا۔
پورے معاشرے میں خوشامد و چاپلوسی تھی۔ ظلم و جور تھا۔ ننگ و عار تھا ——— مگر خاموشی تھی۔
——— عدم سکون تھا مگر سکوت تھا۔
انفرادی و اجتماعی دونوں کے عدل کی پامالی تھی۔ ہزاروں یتیم فاقہ کشی اور کس مپرسی کی وجہ سے بلک بلک کر رو رہے تھے۔
معاشرہ کے تمام قوانین و رواسم اپنا دینی وقار و اعتبار کھو چکے تھے اور لوگوں کو عملاً اس سے انکار تھا۔
مرضیٔ پیغمبرؐ کی جگہ اب مرضیٔ حکومت نے لے لی تھی اور معاویہ عملاً اسلام کی عمارت کو ڈھا دینے کے درپے تھا۔

اس دَور میں بنی امیہ کا حال

ملک و ملت کا تو یہ حال تھا اور اس حال میں بنی امیہ اپنے عیش و عشرت میں لگے ہوئے تھے۔ انھیں اس کا بھی خیال نہ تھا کہ وہ مسلمان سپاہی جو مختلف مقامات پر دشمنانِ اسلام سے مشغول پیکار ہیں ———،
نہ ان کی صحت ٹھیک ہے ———— ؛
اور نہ انھیں ضروریاتِ زندگی میسر ہیں۔
ان کی تو صرف یہ کوشش ہے کہ کسی طرح رعب جما کر، بربریت دکھا کر، تازیانے لگا کر، ہاتھ پاؤں کاٹ کر، زندہ دفن کرا کر لوگوں کو خاموش کر دیں، اپنی حکومت کو تسلیم کرائیں اور سیاسی افراد کو سیاست سے دور رکھیں اور انھیں گوشہ نشین بنا دیں۔

یہ ایسا زمانہ تھا کہ حق پر عمل مفقود تھا اس لیے سرداران بنی امیہ نہ چاہتے تھے کہ حق پر عمل ہو۔ لوگوں نے نیکیوں کو ترک کر دیا تھا اور بدیوں کو اپنا لیا تھا کیونکہ الناس علی دین ملوکھم۔ لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر چلا کرتے ہیں۔

جیسا بادشاہ ویسی رعایا۔

معاشرہ میں ناانصافیاں رائج تھیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حکمران خود ظلم اور ناانصافی کر رہے تھے۔

اس دَور میں عوام کا حال

اس دور میں عام طور پر لوگ اموی سیاست کے زیر اثر تھے اور ان کا رعب، ان کا پلایا ہوا نشہ لوگوں کے رگ و پے میں سمایا ہوا تھا۔

وہ از خود رفتہ ہو چکے تھے۔

اکثر لوگ ظلم و ستم کے ایسے عادی تھے کہ جیسے وہ اسی کے لیے پیدا ہوئے ہیں ۔ گویا انھوں نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ سوائے باربرداری اور خارخوری کے ان کا کوئی کام نہیں۔

کچھ لوگ ایسے تھے کہ عقل و شعور کھو بیٹھے تھے ——

ایسے کہ ——

معاویہ نے ایک مرتبہ بُدھ ہی کو نماز جمعہ کے لیے بلا لیا تو یہ بے وقوف آموجود ہوئے اور اس کے پیچھے نماز جمعہ پڑھنی شروع کر دی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ——

عمرو عاص نے معاویہ کو یہ اطمینان دلایا تھا کہ یہ لوگ

نرے گائے ہیں حقائق کو نہیں سمجھتے، چنانچہ معاویہ نے ان کو اس طرح آزمایا، اور وہ صحیح نرے گائے ثابت ہوئے۔

کچھ سردار ایسے تھے کہ انھوں نے اپنی مفاد پرستی اور جاہ طلبی کے لیے دین کا سودا کر لیا تھا اور وہ خاموش بیٹھ گئے۔

چنانچہ مالک ابن ھبیرہ سکونی کو جب حجر بن عدی کے قتل کی تفصیل کا علم ہوا تو اسے بڑا رنج ہوا اور اس نے حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا ارادہ کر لیا۔ جب معاویہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اس کے پاس ایک لاکھ درہم بھیج دیے ——

اور اس نے یہ رقم لے لی اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

کچھ ایسے تھے جو اپنے خول اور اپنے سوراخ میں جا کر بیٹھ گئے تھے۔ اور اپنی اعتراض کرنے والی زبان اور قلم کو خیر باد کہہ دیا تھا۔

معاشرہ میں کوئی روشن خیالی اور کوئی حس و حرکت نہ تھی اور لوگ اس طرح زندگی بسر کر رہے تھے کہ جیسے کچھ ہو ہی نہیں رہا ہے ——

اور یہ بھی ایک طرح سے ظلم و ستم کی اعانت ہے۔

ان حالات میں کمزور اور بزدل افراد خائف اور ہراساں تھے اور اپنی چادر سے پاؤں باہر نکالنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ ان میں ہمت پیدا کی جائے، انھیں درس شجاعت و جرأت دیا جائے اور ان کی ذمہ داریوں کو ان پر واضح اور روشن کیا جائے۔

امام حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ

حضرت حسین ابن علیؑ اور ان کے باصفا اصحاب ایسے زمانہ میں بھی

حق گوئی اور صداقت سے باز نہیں آتے تھے۔ انھیں نصیحتیں کرتے، وعظ کہتے حق کی دعوت دیتے ——— لیکن ———

اس کا ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

اور معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں نے اپنے کان کسی کے پاس رہن رکھ دیے ہیں یا پھر بہرے ہو گئے ہیں۔ وہ حق کی آواز کو سننے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔

امام حسین علیہ السلام اور آپؑ کے اصحاب نے اس وقت (دورِ معاویہ میں) صرف پند و نصائح سے کام لیا اور برسرِ پیکار نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ———

اس وقت اس کے لیے زمین ہموار نہیں ہوئی تھی۔

کیونکہ ———

اگر آپ اس وقت جہاد کے لیے اٹھتے تو مقصد پورا نہ ہوتا اور لوگ یہ خیال کرتے کہ آپؑ امام حسنؑ کے صلحنامہ کے مخالف ہیں۔ اور دونوں بھائیوں کے نظریہ میں اختلاف ہے ———

اور یہ بھی ممکن تھا کہ ———

آپؑ بھی اپنے بھائی امام حسن مجتبیٰؑ کی طرح زہر سے شہید کر دیے جاتے یا قتل کر دیے جاتے اور اس سے کوئی مقصد بھی حاصل نہ ہوتا اور جو نتیجہ اور دوسروں کے قتل کا ہوا وہی ان کا بھی ہوتا۔

اس صورت میں معاویہ اپنی خودسری و سرکشی سے لوگوں پر مسلط رہتا اور احکام شرعیہ پر اپنے بظاہر عمل کو دکھا کر دین اسلام کی شہ رگ ہی کاٹ دیتا۔ اپنی ریاکاری کے ذریعہ اسلامی زندگی کی بنیاد کو متزلزل کر دیتا اور شیعوں

کو بالکل نیست ونابود کر دیتا اور پھر لازمی طور پر معاویہ کے بعد یزید آتا اور وہ اپنے فسق وفجور کو جاری رکھتا۔

مگر امامؑ نے اپنے ہوشمندانہ طریقہ کار سے خود کو ان سیاسی چالوں سے اور بے مقصد قتل ہونے سے بچا لیا۔ اور محض اس لیے کہ اگر واقعی قتل ہونا اور شہید ہونا ہے تو اس طرح کیوں نہ قتل ہو جائیں جس سے اسلام کو کچھ فائدہ اور اس کے لیے حیات بخش ہو مگر اس کام کے لیے وقت اور موقع کی ضرورت تھی۔

یزید کی تخت نشینی

معاویہ دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کی شیطنت اور خباثت سے لوگوں کو نجات ملی۔ مگر اس کی رشوت، خوشامد، چاپلوسی کی وجہ سے زمین ہموار ہو چکی تھی اس لیے اس کے بعد اس کا بیٹا یزید تخت نشین ہوا اور یہیں سے بنی امیہ کے خلاف اقدامات کی بنیاد استوار ہوئی۔

یہ امر مسلّم ہے اور اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں کہ ——

—— یزید ایک گندہ اور بدکردار انسان تھا۔

وہ اپنے اسلاف کے اس فسق وفجور کا وارث تھا جسے وہ لوگ پوشیدہ اور سب کی نظروں سے بچا کر انجام دیا کرتے تھے۔ مگر اب یزید کے دور میں وہی فسق وفجور بالاعلان ہونے لگے تھے۔

اس کی بالاعلان شراب خواری ——

اور سب کے سامنے قمار بازی ایسی چیز نہ تھی جس سے لوگ بے خبر رہتے۔

اس کا یہ بالاعلان فسق وفجور لازمی طور پر لوگوں کو متاثر کر رہا تھا۔

اس لیے کہ دارالحکومت میں اسلام کے نام سے اسلامی احکام و افکار کو قرآن کی روشنی میں دیکھے بغیر پیش کیا جاتا۔

عقیدۂ قیامت کا بالخصوص اور دیگر عقائدِ اسلامی کا بالعموم مذاق اڑایا جاتا اور لوگ یہ سوچتے کہ قیامت شاید ہی آئے اور اگر آئے گی بھی تو ابھی نہیں، اس کا تو صرف وعدہ ہے اس لیے نفع حاضر اور نقد کی فکر کرنی چاہیئے۔

یزید انتہائی لاپروائی کے ساتھ علانیہ ظلم کرتا ——— لوگوں کا خون بہاتا ——— سب کے سامنے شراب پیتا ——— بزرگانِ دین کی اہانت کرتا ——— آبادیاں ویران کرتا ——— لوگوں کو بے خانماں کرتا ——— انسانوں کے فضل و شرف و وقار سے کھیلتا ——— لہو و لعب میں مصروف رہتا ——— ظلم و فساد کو جائز سمجھتا ——— اور ——— بدر و حنین میں اس کے بزرگوں نے جو شکست کھائی تھی اب اس کا انتقام لینے پر تیار تھا اور پوری قوم کو کیچڑ اور دلدل میں پھنسائے ہوئے تھا۔

اور تعجب یہ کہ یہ سب کچھ اسلام کے نام پر ہو رہا تھا۔ یہ سب کچھ مذہب اسلام اور کتاب خدا کے جھنڈے کے نیچے رہ کر ہو رہا تھا۔

اس کے انھیں اعمال و کردار نے ———

لوگوں کے دلوں میں انقلاب کا بیج بویا اور امام حسینؑ کے اقدام کے لیے زمین ہموار کی۔

امام عالیہ السلام جانتے تھے کہ یزید فاسق و فاجر ہے ———

وہ کسی طرح بھی رہبری و رہنمائی کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

اس لیے ———

آپؑ نے اس کے خلاف اقدام و انقلاب، اپنا فریضہ جانا۔

بیعت طلبی

یزید لوگوں پر زبردستی اور جبریہ امیر و رہنما بنایا گیا تھا۔ اس لیے کہ لوگوں کے ذہنوں میں اس کا سابقہ کردار تھا۔ وہ ایسے شخص کو اپنا امیر و رہنما ہرگز بنانے کے لیے تیار نہ تھے۔

مگر یزید، اپنی طاقت، اپنی فوج، اپنے اقتدار کے بل بوتے پر لوگوں سے اپنی امارت و رہنمائی تسلیم کرا رہا تھا اور اپنا مطیع بنا رہا تھا۔

یقین کیجیے ——————

اگر نیزے کی انیاں لوگوں کے سینوں سے ہٹالی جاتیں تو یزید کا تو کہیں پتہ بھی نہ ہوتا۔ مگر بدنصیبی یہ تھی کہ چند لوگ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا حلوہ مانڈہ اور ان کی روٹیاں بند ہوں۔

عاشور کا سانحہ خود یزید کا اپنا پیدا کیا ہوا تھا۔ اس لیے کہ وہ کسی طرح اس بات پر راضی نہ تھا کہ اپنے مخالفین سے مسالمت مرنجان مرنج اور خاموشی و سکوت کا رویہ اختیار کرے۔

اس نے تو تختِ سلطنت پر بیٹھنے کے فوراً ہی بعد، ابتدا میں چند سربرآوردہ اشخاص سے جن میں سب سے نمایاں حضرت امام حسین ابن علیؑ تھے، اپنی بیعت طلب کر لی۔

اور اگر وہ اس بیعت طلبی پر اس قدر اصرار اور ضد و ہٹ سے کام نہ لیتا تو شاید عاشور جیسا سانحہ پیش نہ آتا۔

وہ اس پر بھی تیار نہ تھا کہ ——————

امام حسینؑ، مثلاً اس کے مقابلہ میں خاموش رہتے اور

وہ جو کچھ کر رہا ہے کرنے دیتے۔ وہ تو اس پر اڑ گیا کہ ——————

حسینؑ کو ہماری بیعت کرنی پڑے گی۔

اور انھیں ہمارے ساتھ ہونا پڑے گا۔

مگر کیا یہ بات ممکن تھی ——————؟

کیا حسینؑ اور اصحاب معاذ اللہ پیٹ کے بندے تھے یا حریص و طماع تھے جو انھیں اس طرح بیعت پر تیار کر لیا جاتا۔ یا انھیں آواز بلند کرنے سے روک دیا جاتا ——————؟

حسین علیہ السلام بیعت کو اپنے لیے ذلت و خواری اور اسلام کے لیے قید و اسیری سمجھتے تھے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو حق کا نام و نشان بھی نہ رہ جاتا۔

اس لیے کہ ——————

ایسی صورت میں یزید کے اسلام نما احکام و قوانین پر حسینؑ کے ہاتھوں حق کی مہر لگی ہوتی۔

ہم لوگوں (شہدائے کربلا) کی تکلیف شرعی اور دینی ذمہ داری

ہم سب نے (شہدائے کربلا نے) بہت غور و فکر کیا اور دیکھا کہ ہم لوگ مصیبت میں گرفتار ہیں اور پھر ایک مصیبت نہیں بلکہ متعدد مصیبتیں ہیں۔

پہلی مصیبت یہ کہ ——————

بے چارہ اسلام تنہا بے یار و مددگار، بے کسی کے عالم میں ہے اور اس پر کفر نے غلبہ حاصل کر لیا ہے۔

دوسری مصیبت یہ کہ ——————

گناہوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور لوگوں کی جرأتِ گناہ بڑھ رہی ہے۔

تیسری مصیبت یہ کہ
امت مسلمہ منتشر و پراگندہ ہے ، آپس میں تفرقہ ہے باہم دشمنی و نفاق ہے ——— اور ———

چوتھی اور آخری مصیبت یہ کہ
لوگوں کو اپنی دینداری پر قائم رہنا بھی سخت مشکل ہو گیا۔

ہم نے دیکھا کہ یزید اسلام کا نام لے کر اسلام کو رسوا اور بدنام کر رہا ہے ، اس کی کوشش ہے کہ اسلام کو اس کے صحیح خط اور راہ راست سے منحرف کر دے۔ وہ بدی اور مفسدات کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ وحیٔ ربانی (قرآن مجید) قیامت اور نماز تک کو کھیل بنائے ہوئے ہے۔

اور اگر ایسا ہوتا رہا تو پھر ———

اسلام کے اصول ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے اور جو کچھ رہ جائے گا وہ اسلامی اصول نہیں بلکہ شیطانی اصول ہوں گے۔

ہم نے دیکھا کہ یزید جن بنیادوں پر چل رہا ہے اس سے شجر اسلام خشک ہو رہا ہے اور بدر و اُحد میں جو خون اس کی جڑ میں ڈالا گیا تھا وہ ضائع ہو رہا ہے۔

اسلام کے درخت میں جو پھول اور شگوفے پیدا ہوئے تھے وہ پژمردہ ہو رہے ہیں۔ دین جان کنی کے عالم میں ہے۔ حق اور عدل معرض تلف میں ہیں۔ انسانی اقدار مٹ رہے ہیں۔ عدل و انصاف، شرف و فضل

ختم ہوگیا ہے۔

ہم لوگ باہم مل کر بیٹھے

ہم لوگ بیٹھے، غور کیا اور دیکھا کہ جو حالات ہم لوگوں پر گزر رہے ہیں اس میں کسی فرق یا تبدیلی کا امکان نہیں۔

اصولاً انسان کے کچھ فرائض اور ذمہ داریاں ہوتی ہیں، اس کے وجود کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ اس مقصد سے انسان کو ہٹنا نہیں چاہیئے اور اپنی خواہشات خود اپنی اور اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے لیے ہونی چاہئیں۔

ہم نے محسوس کیا کہ ——————

جو ناہنجار اور ناروا طریقہ ہم لوگوں کے سر پر زبردستی تھوپ دیا گیا ہے اس میں ہم کوئی فرق اور تفاوت نہیں پیدا کر سکتے۔

لیکن شرعی ذمہ داریاں ہمارے سامنے تھیں۔ خدا اور اس کی مخلوق دونوں ہمارا دامن تھامے ہوئے تھے۔

ہم دیکھ رہے تھے کہ ——————

اگر یزید اسی طرح مسندِ حکومت پر رہا تو اسلام کے نام پر فاتحہ پڑھ دی جائے گی اور اسلامی اخوت، مساوات اور رواداری کا نام تک نہ رہ جائے گا اور انسان کی فلاح و بہبود اور اس کی بھلائی کی گفتگو ختم ہو جائے گی

ہم نے محسوس کیا کہ ——————

دین کا احیار اور شریعت کی حفاظت واجب ہے۔ ہماری غیرت و حمیت نے ہمیں اس کی اجازت نہ دی کہ ہم دیکھیں کہ باطل حق کی سواری پر سوار ہے۔

ہم نے شرافت و مردانگی کے خلاف سمجھا کہ ہم ——
لوگوں کے دکھ درد میں شریک نہ ہوں۔

بالآخر ہمیں ہمارے اسلامی فریضہ نے آمادہ کیا کہ ہم ایک چشمۂ آبِ زلال کو تلاش کریں کہ جس سے کم از کم ہماری آئندہ نسل جو ہمارے کردار کی طرف نگراں ہوگی وہ اس سے سیراب ہو سکے۔

ہم نے دیکھا کہ ——

اب مزید محض تماشائی بنے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ان نابکاریوں، ان ستم گریوں، ان خیانتوں کے خلاف اٹھا جائے ورنہ پھر اس ستم و جور کو سہتے سہتے اپنی جان دے دینی پڑے گی۔

ہم نے محسوس کیا کہ ——

شرعی فریضہ، عقل، فطرت اور وجدان سبھی کا یہی فیصلہ ہے کہ مقابلہ اور مبارزہ سے کام لیا جائے۔ اگرچہ یہ مقابلہ اور جہاد ہم لوگوں کے جان دے دینے پر ختم ہوگا۔ پھر بھی دشمن سے نبرد آزما ہونا چاہیے اور اپنی جان دے دینی چاہیے۔

لیکن سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ ——

اپنے مقصد کو مکمل طور پر متعین کر لیا جائے۔ اور ایک معین اور معلوم سرزمین پر پہنچا جائے تاکہ زمانہ بھر کو معلوم ہو جائے کہ ——

ہماری کوشش کیا ہے۔

اور ہم کیا چاہتے ہیں —— اور آئندہ قیامت تک آنے والوں کو ہم لوگوں کے متعلق ——

صحیح فیصلہ کا امکان رہے۔

اس نبرد آزمائی سے ہمارا مقصد

اب سوال یہ کہ ——————

ہم لوگ کیا کہتے تھے، ہم لوگ کیا چاہتے تھے، کیوں نبرد آزما ہوئے اور کس مقصد کے حصول کے لیے ہم لوگوں نے اپنی جان سے ہاتھ دھویا۔

تو سنیئے! ہم لوگ یہ کہتے تھے کہ ——————

وہ معاشرہ کہ جس کی بنیاد پیغمبر اسلامؐ نے رکھی تھی اور قوم کو پستی سے نکال کر بلندی پر پہنچایا۔ اس میں اسلامی حکومت اور اسلامی نظام ہونا چاہیئے۔

یعنی اس میں قرآن کی حکومت ہو، اس میں آئین محمدیؐ نافذ ہو۔ سارا اقتصادی اور سیاسی نظام و نیز اجتماعی حقوق اسلام کے دیے ہوئے خاکے پر ہوں۔

ہم لوگ یہ کہتے تھے کہ ——————

یہ ساری دولت و ثروت جو صرف چند ہاتھوں میں ہے یہ درحقیقت غریب عوام کا خون چوس کر فراہم ہوئی ہے لہٰذا یہ دولت و ثروت ان کے ہاتھوں سے نکالی جائے اور وہ لوگ جو انسانی اقدار کو پامال کر کے صاحب ثروت بنے ہوئے ہیں ان سے باز پرس کی جائے اور ان کی ساری دولت و ثروت ضبط کر کے صاحبان حق میں تقسیم کر دی جائے۔

ہم لوگ یہ کہتے تھے کہ ——————

اس ہوس اقتدار کو، ان ریاکاریوں کو، ان خود غرضیوں کو مغلوب کیا جائے۔ باطل سے جہاد کیا جائے، ایام جاہلیت کے قوانین، رسم و رواج کو ختم کیا جائے اور عدل و انصاف کی راہ اختیار کی جائے نہ ظلم و جور کی۔

سنتِ رسولؐ پر عمل کیا جائے نہ کہ سنت معاویہ پر،
اسلام ہونا چاہیے نہ محض اسلام نمائی۔ عدالت ہو نہ کہ ظلم، امن قائم ہو نہ بدامنی، اللہ کی باتیں ہوں نہ کہ شیطان کی۔

ہم لوگ یہ کہتے تھے کہ ———

آخر اسلامی معاشرہ میں کچھ لوگ کیوں اپنے کو اتنا مجبور سمجھتے ہیں کہ چاپلوسی پر اُتر آتے ہیں، تملق اور خوشامد کی باتیں کرنے لگتے ہیں اور چند لوگوں کو کیوں ہوس جاہ و مال ہے اور آخر ایسے پست فطرت اور کمینے لوگوں کو مصدر امور کیوں بنایا جاتا ہے۔

ہم لوگ یہ کہتے تھے کہ ———

آخر اس اسلامی معاشرہ میں کیوں اس قدر فتنہ و فساد ہے۔ اہل باطل سے جہاد کیوں نہیں کیا جاتا، چند لوگوں کے ہوس اقتدار کے لیے دوسروں کا خون کیوں بہایا جاتا ہے۔

ہم لوگ یہ چاہتے تھے کہ ———

معاشرہ اسلامی خطوط کو پیش نظر رکھے اور زندگی کی بنیاد عدل، مساوات و مواسات پر قائم ہو۔ ہر شخص اسی حد میں رہ کر ہاتھ پاؤں پھیلائے جو الٰہی قانون نے اس کے لیے مقرر و معین کیا ہے اور ہر شخص زندگی سے اس قدر بہرہ ور ہو جتنی اس نے سعی و کوشش کی ہے۔

ہم لوگ یہ چاہتے تھے کہ ———

تمام نظریات انسانی ہوں، تمام آزادیاں محدود و مشروط اور حدود شرع کے اندر ہوں۔ یزید اور پیروانِ یزید اتنے آزاد نہ ہو جائیں کہ جو چاہیں کریں۔ اسے یا کسی اور شخص کو قرآن کے قوانین میں مداخلت کا حق نہ ہو۔

ہم لوگ یہ چاہتے تھے کہ ——————

یہ خدا ساختگی کے کارخانے بند ہوں ، یہ عہد و پیمان اور یہ بیعت جو بہ جبر و تشدد اور کسی کا گلا گھونٹ کر زبردستی لی جاتی ہے اسے ختم کر دیں مظلوموں اور ستم زدوں کو قید ظلم سے آزاد کرائیں اور انسانوں کے لیے شریفانہ اور باوقار زندگی فراہم کریں ۔ بشریت کو تنگ و تاریک و پراز وحشت چہار دیواری سے باہر نکالیں ۔ لوگوں کے گلے سے غلامی کا پُراز ننگ و عار طوق اتار دیں ۔ غربت و افلاس اور گداگری کو معاشرے سے دُور کریں ۔

ہم لوگ یہ چاہتے تھے کہ ——————

ملتِ مسلمہ میں الٰہی قانون نافذ ہو ۔ قرآن کا مقصد صرف قرآن کی کتابت یا تشریفاتی محافل میں اس کی قرأت ہی نہ ہو ، بلکہ اس کے مفاہیم و مطالب پر نظر رکھتے ہوئے اس پر عمل بھی کیا جائے ۔

ہم لوگ یہ چاہتے تھے کہ ——————

آئندہ کے لیے ہم لوگ صلح و آشتی ، افہام و تفہیم ، عدل و انصاف اور شرافت مندی فراہم کر دیں ۔ انسانیت کو بلندی عطا کر دیں ۔ بشریت و کرامت و سربلندی بخش دیں ۔ اسلام کا قانون ہر شخص کے لیے ہو اور اسلام کے نام پر ، جو بلائیں اور مصیبتیں نازل کی جا رہی ہیں اس سے انسان کو نجات حاصل ہو ۔

ہم لوگ یہ کہتے اور یہ چاہتے تھے کہ ——————

باطل سے ٹکر لی جائے اور اسلام میں از سرِ نو وہی زندگی پیدا کر دی جائے جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کے زمانے میں تھی اور آجکل کے دور کو جو لوگ مذہبی طرزِ فکر

کا نام دے رہے ہیں وہ اس پر نظر ثانی کریں۔
ہم لوگوں نے یہ طے کر لیا کہ ——————
جو کچھ ہم لوگ کہتے اور چاہتے ہیں وہ نہ ہو سکے ——————
تو پھر ——————
ایسی زندگی سے موت بہتر ہے۔

بس! یہ تھیں ہماری باتیں، اور یہ تھا ہمارا نظریہ جس کی پاداش میں ہم لوگوں کو قتل کیا گیا —— ہماری لاشوں پر گھوڑے دوڑائے گئے
ہمارے سر و سینہ کو ——————
تیروں، تلواروں اور نیزوں کا نشانہ بنایا گیا۔
ہاں، ہاں ہم لوگوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ——————
اسلام کو زندہ رہنا چاہیے —— حق کی حکومت ہونی چاہیے —— اور —— لوگوں کو زندہ رہنے کا حق ملنا چاہیے۔
اسی کہنے پر ہم لوگوں کو ستایا گیا، قتل کیا گیا اور ہماری لاشوں کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے۔

حصولِ مقاصد کی راہیں

ایسے ماحول میں اصولی طور پر ہم لوگوں کے پاس اپنی منزل تک پہنچنے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے صرف چار ہی طریقے تھے:

پہلا طریقہ

پہلا طریقہ یہ تھا کہ ہم لوگ سکوت اختیار کرتے۔ مگر اپنی تکلیف شرعی

اپنی ذمہ داری، اپنے احساس فرض اور اپنے حصول مقصد کی دھن کو دیکھتے ہوئے یہ ممکن نہ تھا۔

اور پھر کیا یہ ممکن تھا کہ زمانے کے ایسے بگڑے ہوئے حالات میں سکوت اختیار کیا جاتا ——— کیا یہ ممکن تھا کہ یزید کی بدکرداریوں اور رسوا کن افعال سے اختلاف نہ کیا جاتا اور خاموش رہا جاتا۔

اگر ایسا کرتے یعنی سکوت اختیار کرتے تو ہم لوگ اسلام کی بربادی کو کیا کرتے اور اللہ کو، اپنے فرض کو اور اپنے وجدان کو کیا جواب دیتے؟

کیا یہ ضروری نہ تھا کہ ———

اس وقت کے مروجہ اسلام میں ترمیم کی جاتی، کیا اس کی ضرورت نہ تھی کہ اسلامی معاشرہ کی تجدید کی جاتی اور اسے از سر نو تشکیل دیا جاتا۔

اگر ہم لوگ خاموش بیٹھے رہتے اور اختلاف نہ کرتے تو پھر ان امور کی طرف کوئی توجہ نہ دیتا۔

دوسرا طریقہ

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ اس کا اشتہار دیا جاتا اور ملک میں ہر طرف اطلاع نامے جاری کیے جاتے۔

لیکن یہ طریقہ بھی قابل عمل نہ تھا۔ ہم لوگوں کے بس میں کب تھا کہ کوئی اشتہار یا کوئی اطلاع نامہ جاری کر کے لوگوں کو بتاتے کہ آجکل کے مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے، وہ کس مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں۔

ہم لوگ ملتِ مسلمہ کو بذریعہ اشتہار یا اطلاع نامہ کیسے بتا سکتے تھے

کہ اس اسلام نمائی کے پس پردہ یزید کی حیلہ سازی وریا کاری ہے ، اس ادائیگی نماز کے پیچھے شراب خواریاں ہیں۔

ہم لوگ عوام کو کیونکر مطلع کر سکتے تھے کہ ـــــــ

یزید کے اراکین سلطنت اور ان کے عمال سب بدکردار و بداعمال ہیں اور نظامِ حکومت قابلِ شرم و باعث ننگ و عار کی حد تک پہنچ چکا ہے ـــــــ

عوام خوابِ غفلت میں پڑے سو رہے تھے ۔ ان کو اشتہار یا اطلاع نامہ جیسے سیدھے سادے اور آسان طریقہ سے بیدار کرنا ممکن نہ تھا ۔ اس کے لیے تو ایسی زمین ہموار کرنے کی ضرورت تھی کہ لوگ بچشم خود دیکھ لیتے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے ۔

ہم لوگ اس سے پہلے دربار ابن زیاد اور دربار یزید دیکھ چکے تھے ۔ اور جانتے تھے کہ ابن زیاد اپنی بداعمالیوں کو خود دکھا دے گا اور لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

ہم لوگ جانتے تھے کہ یزید خود بخود یہ شعر پڑھے گا کہ ـــــــ

" لعبت بنو هاشم بالملك
فلا ملك جاء ولا وحی نزل

ـــــــ جس سے اس کے کفر کا برملا اظہار ہو جائے گا ۔

لہٰذا ـــــــ

اس کے لیے ایسی زمین تیار کر دینی چاہیئے کہ یہ لوگ خود اپنی حقیقت و شخصیت کو کھول کر سامنے رکھ دیں ۔

تیسرا طریقہ

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کے کانوں تک چپکے چپکے حقائق پہنچائے جاتے۔ لیکن یہ طریقہ بھی نہ کافی تھا اور نہ ممکن۔

اس کے دو سبب ہیں :

پہلا سبب یہ کہ اس وقت لوگوں کے کان اس قدر بہرے ہو گئے تھے کہ کلمۂ حق بلند کرنے والوں کی آواز ان کو سنائی نہ دیتی تھی پھر ایسے گراں گوش لوگوں سے چپکے چپکے کیا بات کی جاتی۔

دوسرا سبب یہ کہ حکومت بنی امیہ کا جاسوسی کا محکمہ بہت سخت تھا۔ ذرا سا کسی پر شک ہوا یا کسی پر کسی مخالفت کا جھوٹا الزام بھی لگایا گیا تو اس کو فوراً شکنجہ میں کس دیتے، اس کو آزار پہنچاتے اور سزا دیتے تاکہ لوگ حق کہنے والوں کی آواز نہ سُن سکیں۔

جب یہ صورت تھی کہ ایک طرف تو لوگوں کے کان بہرے اور دوسری طرف حکومت کا محکمہ جاسوسی اتنا سخت تو پھر کوئی کس طرح حکومت بنی امیہ کے مفاسد کو برملا بیان کرتا اور اپنی آواز لوگوں کے کانوں تک پہنچاتا۔

چوتھا طریقہ

اب چوتھا طریقہ یہ تھا کہ ——

اُٹھا جائے —— قیام کیا جائے یعنی جہاد کیا جائے اور انقلاب برپا کیا جائے۔ اور یہی ایک بالکل آخری طریقہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی بڑا مقصد اسی وقت پورا ہوتا ہے جب اس کے لیے کوئی بڑا عملی اقدام

کیا جائے۔

اسلام ایک اہم چیز ہے اور اسلام کا مقصد بھی عظیم اور غیر معمولی ہے اس لیے اس مقصد کے حصول کے لیے اپنے سر اور اپنی جان سے ہاتھ دھونا ضروری اور اس سلسلہ میں اپنی جان اور اپنے مال کی قربانی دینی ناگزیر ہے اور بغیر اس کے جو کوشش ہو گی وہ ناکامیاب ہو گی۔

ہم لوگوں نے سوچا کہ ——

بغیر اپنا خون بہائے ہوئے اسلام قائم نہیں رہ سکتا۔ جب تک شجرِ اسلام کو اپنے خون سے نہ سینچا جائے یہ سرسبز و شاداب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہم لوگ ایک زندگی ساز اور حیات بخش جرأت و شجاعت کے ساتھ اٹھے۔ مگر ہم لوگوں کے پاس نذرانہ پیش کرنے کے لیے ——

صرف ایک شے تھی،

یعنی اپنی جان —— سو ہم لوگوں نے اپنی اپنی جانیں، اسلام اور مقصد اسلامی کے لیے قربان کر دیں۔

گزشتہ مجاہدینِ راہِ حق کا نمونۂ عمل ہمارے سامنے تھا

ہم لوگوں نے یہ راستہ بغیر سوچے سمجھے بس یونہی نہیں اختیار کر لیا بلکہ کوشش یہ کی کہ گزشتہ مجاہدین کا، مصلحین کا، مدافعین حقوق بشر، انبیاء، اولیاء اور شہداء کے دستورِ حیات اور طریقہ کار کو اپنے سامنے رکھیں اور دیکھیں کہ ہمارے ان بزرگوں نے زمین کو فساد سے پاک کرنے اور مفسدوں و ظالموں سے مقابلہ کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا۔

ہم لوگوں نے گہری نظر سے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ ——
ان بزرگوں نے دنیا کے سرکشوں سے کیونکر نبرد آزمائی کی۔
پھر دنیا کے بہت سے قارونوں، فرعونوں، نمرودوں کے حالات و نیز دیگر واقعات کا مطالعہ کیا۔
اس کے علاوہ ——————
پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ۲۳ سالہ زندگی اور کفار و مشرکین سے ان کے جہاد کو دیکھا۔ پھر حضرت علی علیہ السلام کے دور خلافت اور اس میں منافقین سے آپؑ کا جہاد ——
ان کے بعد امام حسن مجتبیٰؑ کا معاویہ سے جہاد اور اصلاحِ ملت کے لیے آپؑ کا اندازِ صلح، ان سب کا مطالعہ کیا اور دیکھا۔ ہمارے لیے موجودہ حالات میں صرف ایک ہی راستہ ہے ——————
اور وہ یہ کہ ——
ہم لوگ اُٹھ کھڑے ہوں اور اس کے خلاف کوئی اقدام کریں۔

راستہ واضح اور روشن ہے

ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ ——————
بغیر ایک خونین انقلاب کے ہمارے عقیدہ اور ہمارے مقصد میں رنگینی نہیں آئے گی۔ اور یہ انقلاب بھی سطحی نہ ہو بلکہ گہرائی لیے ہوئے ہو تب ہم لوگوں کا مقصد پورا ہوگا۔
اسلامی معاشرہ کو اس وقت کسی فداکار اور جان کی قربانی دینے والے کی ضرورت ہے۔ ایسے فداکار کی جو سر دھڑ کی بازی لگادے۔ دل کی

گہرائیوں سے فریاد کرے اور شدّتِ تشنگی میں بھی صدائے استغاثہ بلند کرے سارے مصائب برداشت کرے، منہ سے آہ نہ کرے۔

ہم لوگ، اسلام اور موجودہ و آئندہ نسلوں کے سامنے خود کو ذمّہ دار اور جواب دہ سمجھتے تھے۔ اس لیے پختہ ارادہ کر لیا کہ ہم لوگ اپنی ذمّہ داریوں کو باحسن وجوہ پورا کریں گے۔

بات یہ ہے کہ ——

اسلام کی نظر میں، آدمی نہ تنہا اپنا ہے نہ تنہا اپنے خاندان کا ہے نہ تنہا اپنے اہل و عیال کا ہے بلکہ اس میں اس کی قوم و ملت کا بھی حصہ ہے۔

ہم لوگوں نے عزم مصمم کر لیا کہ ——

قوم و ملت کے کانوں سے ٹھونسی ہوئی روئی نکال دیں تاکہ یہ لوگ آوازِ حق سُن سکیں۔ ان کے عقل و فہم کے ہاتھ پاؤں میں پڑی ہوئی زنجیروں کو کاٹ دیں۔ جو لوگ ظلم کی تلواروں کی زد سے بچ رہے ہیں اور معتوب ہیں ان کے مصائب کو ختم کرائیں۔ انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کا سلسلہ بند کرائیں۔ اپنے دین کی نصرت و حفاظت کریں، جہاد کریں اور اپنی تمام تر توانائیوں کو حصولِ مقصد کے لیے صرف کر دیں۔

اپنے مقاصد متعین تھے، اپنا رہبر معلوم تھا اور قطعی یقین تھا ——

مولا حسینؑ حق پر ہیں۔

پیغمبرِ اسلامؐ نے اِنھیں کے لیے فرمایا ہے کہ

"حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔"

ہم لوگوں کو یقین تھا کہ امامؑ کا اس مقصد کے لیے قیام منشار اور

رضائے الٰہی کے عین مطابق ہے کیونکہ رسول مقبولؐ فرما چکے ہیں کہ

میرے یہ نواسے حسنؑ و حسینؑ دونوں امام اور
پیشوائے خلق ہیں۔ خواہ جہاد و قیام کریں خواہ
بیٹھے رہیں۔

اس طرح ہمارے سامنے اپنا راستہ بالکل واضح اور روشن تھا کہ یا راہِ تسلیم اختیار کریں اور بیٹھے رہیں یا اٹھ کھڑے ہوں اور اپنی جانوں کی بازی لگا دیں۔

مگر امام حسینؑ نے ہمیں سکھایا کہ ——————

دیکھنا! ذلت کی زندگی کبھی قبول نہ کرنا۔

اس لیے اب صرف ایک، ایک ہی راستہ ہم لوگوں کے پاس تھا اور وہ یہ کہ اٹھ کھڑے ہوں اور اپنی جانوں کی بازی لگا دیں۔

اس وقت ہماری ملتِ اسلامیہ کچھ اس طرح مدہوش تھی کہ باہم گفتگو کے لیے بھی تیار نہ تھی تاکہ اس کی اصلاح کی جاتی۔ ایسی خواب غفلت میں تھی کہ محض گفتگو یا اشتہار و اعلان سے بیدار نہ ہوتی۔

اس لیے —————— ہمارے لیے ایک اہم انقلاب اور وہ بھی ایک خونی انقلاب کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اس وقت صرف ہمارے خون کا بہنا، ہماری دلخراش فریادیں ہماری جاں سوز آہیں ہی معاشرہ میں انقلاب لاکر اسلام میں جان ڈال سکتی تھیں۔

ہاں ہاں!

ہم لوگ کشتۂ اشک و گریہ ہیں ——————

ہم لوگ درماندہ اور لاچاروں کے ہمدرد و غم گسار ہیں۔

ہم لوگ اپنے دین کی حفاظت میں مقتول و مذبوح ہوئے اور اپنے خون میں نہائے۔ ہم لوگوں نے امت مسلمہ کی حمایت میں اپنی جان دی اور ظلم وجور اور نابکاریوں کی راہ میں رکاوٹ بنے۔

ہم لوگ جانتے تھے کہ ——————

احیائے دین کے لیے راہِ خدا میں اپنی جان دے دینا اور شہید ہو جانا یہی انسان کے لیے سب سے بڑا شرف ہے اور اس شرف کے حصول سے ہم لوگوں نے اپنا منہ نہیں موڑا۔

ہم لوگوں نے جس جنگ کی ابتدا کی وہ درحقیقت انبیاء کے جہاد کے سلسلہ کی ایک کڑی اور جاہلیت کے خلاف حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غزوات کا ایک ضمیمہ ہے۔

بس فرق یہ ہے کہ ہماری جنگ ایسی جدید جاہلیت سے تھی جو اسلام کے جھنڈے کے نیچے تھی اور اسلام کا نام لے رہی تھی۔

درحقیقت ہماری روز عاشورہ کی جنگ، سقیفہ کے دن سے ہی شروع ہوئی ——————

اس دن سے شروع ہوئی جس دن سرکار رسالتؐ نے وفات پائی اور جاہ طلب و مطلب پرستوں نے گروہ بندی، سازش اور جتھہ بازی شروع کر دی۔ "منا امیر ومنکم امیر" کی آواز بلند کی اور ایک دوسرے انداز، دوسرے رنگ اور دوسری شکل سے اسلام پر حملہ آور ہوئے اور ہم لوگوں کو تہِ تیغ کرنے لگے۔

مگر ہم لوگوں نے بھی اپنے حصول مقصد کی مقدس راہ میں جسے ہم لوگوں نے خود اختیار کیا تھا نہ صرف یہ کہ اپنے مال کی پرواہ نہ کی بلکہ اپنی جان تک قربان

کردی ـــــــــ اور نہ فقط جان و مال بلکہ اپنی آل اولاد ، اپنے اعزا و اقارب کے انجام کی بھی فکر نہ کی۔

معلوم تھا کہ ـــــــــ
ہم لوگوں کے بعد یہ سب مصائب کا شکار ہوں گے

معلوم تھا کہ ـــــــــ
ہم لوگوں کے بعد ہماری عورتوں اور بچوں کو قید کیا جائے گا

اور ہماری عورتوں اور بچوں نے بھی اس علم کے باوجود کہ وہ کن مصائب میں مبتلا ہوں گے نہ صرف یہ کہ ہماری ہمراہی سے منہ نہیں موڑا بلکہ منت و سماجت کی ، اصرار کیا اور کوشش کی کہ کربلا میں ہم لوگوں کے ساتھ رہیں۔

ہم لوگوں کو اپنے اس انقلاب پرور اقدام میں کسی فوری کامیابی کی امید نہ تھی۔ اس لیے کہ ہم جانتے تھے کہ ہماری دشمن حکومت کا پروپیگنڈا ہم لوگوں کے خلاف بہت زبردست ہے۔

وہ ہمیں خارجی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔
ہمیں ملحد و مشرک کہتے ہیں۔

ان کے پاس فوج و لشکر کی بہت بڑی طاقت ہے۔ ہم لوگوں نے یہ قدم اس لیے اٹھایا کہ موجودہ نسل سے زیادہ آئندہ نسل ہمارے متعلق صحیح فیصلہ کرے گی۔ بلکہ ایک نسل کے بعد دوسری نسل بہتر سے بہتر طور پر ہمیں پہچانے گی۔ لہٰذا حال سے زیادہ مستقبل میں ہماری کامیابی مضمر ہے۔

تاریخ اور میدانِ جنگ

جہاد کربلا سے پہلے ہم ایک جگہ کے باشندے نہ تھے بلکہ مختلف مقامات

پرسکونت پذیر تھے ۔ اپنے اجتماع کے لیے ہم لوگوں نے ایک ایسی جگہ معین کی
جو ایک دورافتادہ ، بیابان اور طوفان زدہ سرزمین تھی ۔
جس کا نام کربلا تھا۔
اور وہاں اپنے عملی اقدام کو شروع کرنے اور بحیثیت
حزب اختلاف اپنے وجود کے اعلان کے لیے ہم لوگوں نے ایک تاریخ مقرر کی
جو ماہ محرم الحرام سنہ ۶۱ھ کی تاریخوں میں سے ایک تاریخ عاشورہ ———
یعنی دسویں محرم الحرام تھی ۔
اس طرح کربلا میں شمع حق کے پروانوں کی محفل سجی اور یوم عاشورا
اسلام کو دوبارہ زندہ کرنے کی تاریخ قرار پائی۔
اب کربلا کا رنیلا میدان ———
انسان دوست ، عدل وانصاف کا مطالبہ کرنے والوں اور
توحید پرستوں کے لیے میدان کارزار بن گیا اور عاشور کا دن وہ دن بن گیا جس
میں کربلا کے جانبازوں نے خود اپنا تعارف کرایا اور اہل عالم کو بتایا کہ ———
اپنے نصب العین اور اپنے مقصد پر کیونکر قائم رہا جاتا ہے ۔
اور اپنے عقیدے اور اپنے نظریہ کے دفاع میں کیونکر جنگ کی جاتی ہے ۔
اسی دورافتادہ بیابان میں پیاسوں کے حلقوموں سے ایسی آواز بلند
ہوئی جس نے تمام عالم بشریت کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اور اس روز ایسے ایسے
معرکے پیش آئے کہ جن کا نام تاریخ نے اپنے اندر ———
اور ———
تمام انسانوں کے ذہن و دماغ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے
نقش کرلیا ——— !

ہمیں ہماری راہ سے روکنے اور نصیحت کرنے والے

ہمیں اپنا راستہ معلوم تھا، اور اسی پر ہم لوگ گامزن تھے۔ ہمارے احباب درجۂ شہادت کے شرف سے واقف تھے اور انبیاء کی میراث و دین خدا کے احیاء کے لیے قدم بڑھا رہے تھے۔

اس دوران میں سفر میں چند نصیحت کرنے والے ہمارے پاس آئے اور ہمیں وعظ و پند فرمانے لگے۔

جتنے منہ اتنی باتیں تھیں ——

جتنے لوگ تھے اتنی ہی راہیں ہمارے سامنے رکھتے۔

بعض لوگ زن و فرزند کا مسئلہ کھڑا کر کے ہمارا راستہ روک رہے تھے۔ بعض ہم کو موت سے ڈرا رہے تھے۔ کچھ لوگ قرآنِ صامت کی آیات و احادیث نبوی ؐ پیش کر رہے تھے۔

مگر قرآن ناطق ہمارے ساتھ تھا۔ وہ تلویحاً و اشارۃً کہہ رہا تھا کہ آیۂ قرآنی ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کا مطلب کسی مومن کو شرفِ شہادت سے روکنا نہیں ہے ——

بلکہ اس کے برعکس ——

جہاد و قربانی سے گریز، احیائے دین سے فرار اور قرآن کی حفاظت کو چھوڑ کر خود اپنی حفاظت کرنا درحقیقت خود کو ہلاکت میں مبتلا کرنا ہے۔

اور صرف خود ہی کو نہیں ——

بلکہ اپنی پوری قوم کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

خوش قسمتی سے ہم لوگوں پر ان ناصحین کے پند و نصائح کا کوئی اثر نہ ہوا۔

اوران کی باتیں ہم لوگوں کے عزائم وافکار کو مغلوب ومتاثر نہ کرسکیں اور ہم لوگ آگے بڑھتے گئے اور مختلف راستوں، صحراؤں، منزلوں اور آبادیوں سے اپنے گم شدہ اور روپوش ساتھیوں کو لیتے ہوئے ——————

میدان کربلا میں پہنچ گئے۔

کربلا کیسا مقام تھا

کربلا ایک دور افتادہ اور کوردِہ بیابان تھا۔ جہاں کوئی آبادی نہ تھی بس صرف چند بادیہ نشین عرب اس کے اطراف رہا کرتے تھے اور کبھی کبھی اس بیابان میں کچھ کاشت کر لیا کرتے تھے۔

اس کی زمین خشک اور ریگزار تھی۔

دن میں گرمی اور رات میں سردی پڑتی تھی۔ کوئی شخص اس بیابان میں رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ پانی وہاں سے دور تھا۔ وہاں زندگی بسر کرنا مشکل تھا۔

مگر یہی بیابان آج لوگوں کے لیے میدانِ انتخاب بنا ہوا تھا۔ اہلِ عراق یہ چاہتے تھے کہ حسین ابن علیؑ ان کے حاکم ہوں۔

اور اہلِ شام و نیز چند دنیا پرست یزید کو حاکم بنانا چاہتے تھے۔

چنانچہ اہلِ عراق نے خط لکھ کر حضرت حسین ابن علیؑ کو اپنے ملک میں آنے کی درخواست کی اور امام حسینؑ نے ان کی یہ درخواست قبول کر لی اور تشریف لے آئے۔

اور اب وہ مقام اور وہ دن آگیا کہ جس میں یہ لوگ طے کر لیں کہ کس کو منتخب ہونا ہے —————— امام حسین کو ؟

عراقیوں نے دیکھا کہ اگر ہم اس پر قائم رہے تو اس کے لیے جان دینی پڑے گی۔ اس لیے وہ پیچھے ہٹ گئے اور نتیجہ میں یزید منتخب کر لیا گیا۔

اور کاش!

اس کے انتخاب پر ہی یہ لوگ قصہ ختم کر دیتے۔ مگر نہیں!

ان لوگوں نے یزید کی طرف داری میں، حسین ابن علیؑ کے خلاف تلوار تک اٹھا لی۔

کربلا مقامِ تعارف تھا

یہاں اہلِ ظلم و ستم کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے صحیح خدوخال پیش کریں۔ ظلم کی آستینوں سے اپنے ہاتھ باہر نکالیں اور اپنے سرپرستوں کے مصالح کی حفاظت کے لیے دردناک ترین کام انجام دیں، جس کو چاہیں ماریں، جسے چاہیں قتل کریں جسے چاہیں ستائیں جسے چاہیں یتیم کریں۔

کربلا حق و باطل کو پرکھنے اور اسے الگ الگ کرنے کا مقام تھا

کربلا کے اس میدان میں وہ لوگ بھی پہچان لیے گئے جو خدا پرست تھے اور وہ لوگ بھی پہچان لیے گئے جو جاہ پرست، دولت پرست اور دنیا پرست تھے۔

اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ——————

کون شخص مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لیے آیا تھا

اور کس کا مقصد صرف خوشنودیٔ خدا تھا۔

اگر واقعہ کربلا رونما نہ ہوا ہوتا تو یہ کیسے سمجھ میں آتا کہ آدمی اپنے مقصد کے حصول کی راہوں میں کس قدر خلوص سے کام لیتا ہے۔ اور یہ کیسے معلوم ہوتا کہ

انسان کس حد تک شجاعت، مقاومت اور صبر و تحمّل کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔
چنانچہ شبِ عاشور اور روزِ عاشور وہ سارا خلوص اور وہ ساری فداکاری
ظاہر ہو گئی اور شہدائے کربلا نے مرتے دم تک ——————
عالمِ نزع اور حالتِ جانکنی میں بھی ——
اپنے اپنے مقصد و نصب العین کو فراموش نہیں کیا۔
مسلم بن عوسجہ نے حصولیابیٔ مقصد کے درپے رہنے کے لیے اپنے دوست
اور رفیق کار حبیب ابن مظاہر کو وصیت کی۔ ان کی ہمت بڑھائی اور یہ دکھا گئے کہ
وہ انسانیت کی عزت و شرافت کے لیے کس قدر کوشاں ہیں۔
کربلا کا میدان وہ ہے جہاں لوگوں کی اصل حقیقت کا پتہ چل گیا۔ اور یہ
معلوم ہو گیا کہ کس کے دل میں واقعاً کیا ہے۔
اور جو شخص جیسا تھا وہ صاف صاف نظر آنے لگا۔
وہ لاکھوں انسان جو امتِ محمدیہ سے تعلق رکھتے تھے اور خود کو مسلمان
کہتے تھے۔ ایک ایسی ہستی کی راہ میں حائل ہونے کے لیے اٹھے جو اسلام کا زندہ ترین
نمونہ تھا۔ اسے مارا، قتل کیا اور اس کا مال و اسباب سب لوٹ لیا۔
یہ لوگ کافر نہ تھے —— مسلمان تھے، دین والے تھے۔
خدا پر یقین رکھتے تھے اور وہ اسلام کے تابع بھی تھے۔
مگر کس اسلام کے ——————؟
یزیدی اسلام کے، معاویہ اور بنی امیہ کے اسلام کے۔
یہ لوگ اس اسلام کے تابع تھے جس میں نبیؐ کے فرزند کا قتل جائز تھا۔
اور بغیر کسی شرعی دلیل کے اس کا خون بہانا مباح تھا۔ جس میں خاندانِ رسالت
کی ہتک حرمت کی اجازت تھی۔

یہ سب مسلمان تھے ——————

مگر ایسے مسلمان کہ آوازِ حق کو دبانے کے لیے شور و غوغا بلند کیے ہوئے تھے، تالیاں بجا رہے تھے، خشت باری کر رہے تھے تاکہ اس میں حسینؑ کی آواز گم ہو کر رہ جائے اور ان کے حق میں رسولؐ کے احترام کو بھی لوگ نظر انداز کر دیں اور اس کی شہادت کے بعد اس کی عورتوں اور بچوں کو اسیر کریں، شہر بہ شہر پھرائیں اور ملحد اور کافر کہیں۔

ہاں ہاں ——— کربلا ایک جنگ کا میدان تھا ——————

حق و باطل کی جنگ کا میدان۔

دو فوجیں ایک دوسرے کے مقابل تھیں۔ یہ دنیا پرستوں اور خدا پرستوں کے درمیان جنگ تھی۔ یہ رذیلوں اور شریفوں کی جنگ تھی۔

یہ وہ جنگ تھی جس میں لاکھوں کے گروہ نے چند درہم کے لیے ایک معزز ترین اور با مقصد ترین انسان کو قتل کر دیا۔

حسینؑ کے مقابلہ میں دشمن کی جنگ درحقیقت صاحبِ فضیلت و طہارت کے مقابلہ میں اراذل و اوباش کی جنگ تھی۔

ہمارے رفیقانِ کار

تم نے سنا ہوگا کہ ہمارے ساتھی صرف چند تھے۔ مگر یہ تو انتہائے کار کی بات ہے۔ آغازِ کار میں ایسا نہیں تھا۔ ابتدا میں ہمارے ساتھ بہت سے لوگ تھے جو اپنے مطلب سے، شبِ عاشور تک کربلا میں ہمارے ساتھ تھے۔

مگر جب انھیں اندازہ ہو گیا کہ صبح کو کیا ہونے والا ہے تو ہمارا ساتھ چھوڑ گئے ——————!

اور اب جو باقی رہ گئے وہ خالص، پرکھے، چھنے اور چنے ہوئے لوگ تھے ______ !

جس روز ہم لوگوں نے مکہ سے (کوفہ کی جانب) کوچ اور جہاد کا ارادہ کیا تو بہت سے لوگ ہمارے ساتھ ہو لیے۔ بلکہ زیادہ تعداد توان لوگوں کی تھی جو سامنے حاضر ہو کر عقیدت و ارادت کا اظہار کر کے ساتھ ہوئے تھے۔

لیکن دیکھا کہ اپنا مفاد خطرے میں ہے تو ہم سے کٹ کر الگ ہو گئے اور جان جانے کے خوف سے ہمارا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔

الغرض ہمارے ہمراہ تین قسم کے لوگ تھے۔

۱۔جاہ طلب

ہم لوگوں کے ساتھ ایک گروہ جاہ طلب لوگوں کا تھا جو رتبہ اور عہدہ کی لالچ میں امام حسین علیہ السلام کے ساتھ ہو گئے تھے۔

یہ لوگ ہر منزل پر ہمارے ساتھ رہے۔ بلکہ اکثر مواقع پر تو یہ لوگ ایسے تیور دکھاتے کہ جیسے معلوم ہوتا کہ یہی سب کے سردار، سرپرست، رہنما اور حاکم ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ لشکرِ حسینؑ میں رہ کر ریاست و حکومت کی مشق کر لیں تاکہ جب حسین ابن علیؑ کی فتح ہو تو انھیں کہیں کی حکومت یا کوئی عہدہ مل جائے۔

ان کا خیال تھا کہ شہر کوفہ حسین ابن علیؑ کا دارالخلافہ ہوگا اور ایسی صورت میں اونچے اونچے عہدے اور منصب ان لوگوں کے ہاتھ آئیں گے اور یہی لوگ آپؑ کی حکومت کے اداروں کی تشکیل کریں گے۔

ان میں سے کوئی بصرہ کا والی ہوگا ، کوئی ایران کا فرمانروا ہوگا۔

اور کوئی مصر کا حاکم بنے گا۔ اور اسی ارادے سے یہ لوگ ہمارے رفیق و ہمراہی بنے رہے اور شبِ عاشور تک امام حسینؑ کے بابرکت دسترخوان سے کھاتے پیتے اور شکم سیر ہوتے رہے۔

۲۔ مالِ غنیمت کے خواہشمند

دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو جنگ و جہاد سے صرف مادی منفعت حاصل کرنا چاہتے تھے اور عام طور پر کسی جشن مسرت اور مجلس عزا میں صرف اس خیال سے شریک ہوتے تاکہ کاسہ لیسی کر کے دسترخوان کی بچی ہوئی اشیاء میں سے کچھ وہ بھی حاصل کر لیں۔ ان کا نہ کوئی گھر تھا نہ بار، نہ کنبہ نہ خاندان، نہ کوئی سر نہ سامان۔ ہمیشہ مختلف خرمنوں سے خوشہ چینی کرتے رہتے۔ ان کا کوئی مستقل کاروبار نہ تھا۔

ان کا خیال تھا کہ امام حسین کے ساتھ اس سفر میں عمدہ سے عمدہ کھانے کو ملے گا، بے حد و حساب مال و متاع ہاتھ آئے گا۔ اور اگر جنگ کی نوبت آئی تو امام حسینؑ فتحیاب ہوں گے اور ہمیں مال غنیمت ملے گا۔ کنیزیں ملیں گی، تلواریں، زرہیں، گھوڑے اور خچر ہاتھ آئیں گے۔ اور اس بنا پر وہ اپنے اپنے خیالی منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکیں گے۔

مگر شب عاشور امام حسینؑ کے خطبے نے ان دونوں گروہوں پر یہ واضح کر دیا کہ یہاں انھیں کام کیا کرنا ہے۔ ویسے تو اس سے پہلے بھی ان پر اس سفر کے مقصد کو واضح کر دیا گیا تھا۔

چنانچہ امام حسین علیہ السلام جس روز مکہ سے کوچ فرما رہے تھے، آپؑ نے صرف اپنے فداکار اور جانباز دوستوں کو دعوتِ سفر دی، ہر کس و ناکس کو ساتھ چلنے کے لیے نہیں کہا۔

آپؑ نے فرمایا تھا کہ

"من کان باذلاً فینا مهجته
...... فلیرحل معنا۔"

"جو شخص ہم لوگوں کے لیے اپنی جان دینے کو
تیار ہو وہ ہمارے ساتھ چلے۔"

بلکہ راستے میں جہاں جہاں منزل کرتے اپنے ہمراہیوں پر یہ بات واضح کرتے رہے کہ ______

دیکھو! اس سفر میں عہدہ اور منصب یا مالِ غنیمت یا دولت و ثروت میں سے کچھ بھی حاصل نہ ہو گا۔

مگر یہ دل کے اندھے، امام حسین علیہ السلام کی باتوں کو محض تکلف و انکساری پر محمول کرتے رہے۔

اس لیے شب عاشورا امام حسینؑ نے یہ ضروری سمجھا کہ حقائق سے مکمل پردہ اٹھا دیں اور واضح طور پر بتا دیں کہ اب صبح کو کیا ہونے والا ہے تاکہ کسی شخص کی جان اس کے مقصد کے خلاف نہ چلی جائے اور جو اپنا خون بہانا نہیں چاہتا اس کا خون بہہ کر دوسرے شہدار کے خون کو آلودہ نہ کر دے۔

اس لیے شب عاشور آپؑ نے خطبہ دیا اور اس میں صاف صاف بتا دیا کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ اور اس لیے تاکہ کسی کے پاس کوئی عذر نہ رہے یہ بھی کہہ دیا کہ ______

میں نے اپنی بیعت تمہاری گردنوں سے اٹھا لی۔ تم میں سے جو جانا چاہتا ہے، چلا جائے۔ اس لیے کہ یہ لوگ صرف ہمارا خون بہانا چاہتے ہیں، ان کو

اور کسی سے کوئی سروکار نہیں۔

امام حسینؑ کی اس گفتگو نے ان دونوں گروہوں کی آنکھیں کھول دیں اور انھیں معلوم ہو گیا کہ ——————

اس سفر میں عہدہ و منصب کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ دسترخوان کی عمدہ عمدہ لذتیں میسر نہیں آئیں گی اور اب تک جو کچھ کھا لیا ہے یا یوں کہیے کہ ضائع کیا ہے وہ مفت ہے مگر اس کا حساب قیامت میں دینا ہوگا۔

واقعاً اگر یہ لوگ کربلا میں رہ جاتے تو شاید اس سے بہتر زندگی ان کو نصیب نہ ہوتی۔ ایک مجاہد فی سبیل اللہ کی حیثیت سے تمام انسانیت پر ان کا احسان ہوتا۔ اور ان کی گردن اونچی رہتی۔

مگر ان کے پیش نظر تو موت کا ڈر تھا۔ لہٰذا ان لوگوں نے بہتر سمجھا کہ وہاں سے سرک لیں —— پھر امام حسین علیہ السلام نے چراغ بھی گُل کر دیا تھا۔ اس سے ان لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور رات کی تاریکی میں رخصت ہونے لگے ——————

کسی نے دُور سے خدا حافظ کہا اور رخصت ہوا۔ کسی نے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور رخصت ہوا —— اور —— بعض نے تو خدا حافظ بھی نہ کہا اور چل دیے۔

اب صرف ہم لوگ رہ گئے تھے اور کوئی نہ تھا۔

۳۔ مخلص و پاکباز

تیسرا گروہ مخلصین اور پاکبازوں کا تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جو آزمائے ہوئے، پرکھے ہوئے اور چُنے ہوئے تھے۔

یہ لوگ امام حسینؑ کے سامنے بالکل اگلی صف میں تھے۔ یہ سب کے سب آپ پر فدا ہونے والے، اپنی جان دے دینے والے، روحانی اور اخلاقی دونوں حیثیت سے بڑے شجاع اور بڑے جرأتمند اور انتہائی مخلص تھے۔

ان میں کچھ بچے تھے ——— کچھ نوجوان تھے ——— کچھ جوان تھے ——— کچھ ادھیڑ عمر والے تھے ——— کچھ سن رسیدہ تھے ——— کچھ بالکل ضعیف العمر تھے۔ جیسے:

عون وجعفر، عبداللہ اور قاسم، علی اکبر اور ابوالفضل، حبیب ومسلم، زہیر قین، عابس اور وہب اور اسی قبیل کے دسیوں لوگ تھے۔

ہاں اِنھیں میں ایک علی اصغر بھی تھے۔

اب خیمۂ حسینؑ میں صرف یہی لوگ باقی رہ گئے۔ مگر ہم لوگوں کو امام حسین علیہ السلام کا انتباہ، ان کا بتانا اور بار بار یاد دلانا، آئندہ خطرات سے آگاہ کرنا اور ڈرانا ان کی چوکھٹ سے دور نہ کر سکا۔

آپؑ نے فرمایا تھا کہ ———

کل مرنا ہے اور خون بہنا ہے لہٰذا تم لوگ بھی چلے جاؤ۔ مگر ہم لوگ اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔

آپؑ نے فرمایا ———

دیکھو! اب تم لوگوں پر ہماری کوئی بیعت نہیں ہے۔ اور قیامت کے دن بھی میں تم لوگوں پر کوئی دعویٰ نہ کروں گا۔ مگر ہم لوگوں نے یہ قبول نہ کیا کہ آپؑ کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں۔ لہٰذا مجبوراً امام حسینؑ نے فرداً فرداً ایک ایک کا نام لے کر کہا:

اے بریر! اے عابس! اے عون، اے فرزندانِ عقیل!

اے قاسم ! اے علی اکبر! اے ابوالفضل! تم میں سے ہر ایک ہمارے گھر کے ایک فرد کا ہاتھ پکڑ لے اور اپنے ساتھ اسے بھی نکال لے جائے۔

مگر پھر بھی یہ لوگ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔

بالآخر جب امامؑ نے ایک ایک کو پکار کر کہا تو ہم لوگ مجبور ہو گئے کہ جواب دیں کہ ——————

مولا و آقا! ہم لوگ چلے جائیں ——— ؟

آخر کہاں چلے جائیں ——————— ؟

اور کیوں چلے جائیں ؟

کیا آپ کو تنہا چھوڑ کر چلے جائیں ——— لاواللہ یہ ہم سے نہ ہوگا۔ خدا کی قسم! ہم لوگ آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ ہاں اگر ہمیں موت نے چھڑا دیا تو یہ اور بات ہے۔ ورنہ خدا کی قسم! اگر آپؑ کی راہ میں ہم لوگ ہزار بار بھی قتل کیے جائیں اور پھر زندہ کیے جائیں اور پھر قتل کیے جائیں تو بھی ہم لوگ آپؑ کا ساتھ چھوڑ کر نہ جائیں گے آپؑ ہی کے ساتھ رہیں گے چاہے یہ دشمن ہمارے جسموں کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دے تو بھی آپ کو نہ چھوڑیں گے۔

ان پاکبازوں کی خصوصیات

اب یہ لوگ جو امامؑ کے ساتھ رہ گئے تھے، معلوم ہے کہ ——

یہ کیسے لوگ تھے ؟

یہ لوگ عالم میں انتخاب تھے ، یہ لوگ صفاتِ انبیاء اور میراثِ انبیاء کے حامل تھے۔ عہدِ رسولؐ کے بیش قیمت ذخیرہ اور سرمایہ تھے۔

یہ لوگ اپنے عصر کی مثالی شخصیت تھے۔ ان میں کے نوجوان اور بچے بھی مرد صفت اور بزرگ منش تھے۔

بچّے کیسے تھے؟

سب کے سب ادب آشنا ——————

سب کے سب تربیت یافتہ —— سب کے سب پیار کرنے کے قابل، جو بچپن کی تمام دلچسپیوں کو چھوڑ کر ہم لوگوں کے ساتھ ہو گئے تھے۔

جوان کیسے تھے؟

سب خوش اخلاق، خوش شکل، خوش رفتار، مخلص وفادار، جن کی جوانی کی امنگیں انھیں ان کے فریضے کی انجام دہی اور تلاش حقانیت و روحانیت سے مانع نہ تھیں۔

بوڑھے اور سن رسیدہ کیسے تھے؟

سب کے سب حق گو اور حق جُو، سب کے سب عابد و زاہد، پاکباز، خدا پرست کہ گویا جن کو اللہ نے رسول مقبولؐ اور حضرت علیؑ کے زمانے ہی سے حسینؑ اور ان کے جہاد کے لیے فراہم کر رکھا تھا۔

کوئی اسّی سال کا تھا، کوئی نوّے سال کا مگر سب جوانوں کی طرح پُر بہار اور زندہ دل۔

ہمارے گروہ میں کچھ غلام بھی تھے مگر ایسے غلام جو تمام آزاد لوگوں سے زیادہ آزاد، جن کے جسم کی پوست تو سیاہ ضرور تھی لیکن ان کا دل سفید

اور روشن تھا۔

ہمارے گروہ میں ایسے لوگ بھی تھے جن کی ابھی نئی نئی شادی ہوئی تھی
مگر انھوں نے میدان جنگ کو حجلۂ عیش پر ترجیح دی تھی
اور اپنے دست و پا میں اپنے خون کی مہندی لگائی تھی، اپنے
چہرے کو اپنے خون سے رنگین کیے ہوئے اور سُرخ رُو بنے ہوئے تھے۔

ہمارے رفقار درحقیقت تمام عالم میں انتخاب تھے ——

یہ کتنے پاک دل، کتنے یقین محکم اور ثباتِ قدم رکھنے والے
کتنے خلوص اور فداکاری کا مظاہرہ کرنے والے اور کتنے امام حسینؑ کے مقصد کو
سمجھنے والے تھے کہ جتنا جتنا ان پر دباؤ اور دشمنوں کی یلغار بڑھتی گئی ان کے
چہرے پر تروتازگی اور شادابی زیادہ ہوتی گئی۔ اور مقصد کے حصول کے لیے
وہ اتنے ہی زیادہ کوشاں ہوتے گئے۔

حد یہ ہے کہ ——————

جوانوں اور نوجوانوں تک کو معلوم تھا کہ یہ ہم کیا کر رہے ہیں۔
کیوں کر رہے ہیں —— اور —— ایسا ہمیں کیوں کرنا چاہیئے۔

قاسم ابن حسنؑ جو ابھی سنِ بلوغ کو بھی نہ پہنچے تھے مگر وہ
موت کو شہد سے زیادہ شیریں سمجھ رہے تھے۔

عبداللہ، حالانکہ بالکل کمسن اور بچّے تھے مگر امام حسینؑ
کی حفاظت اور ان کے دفاع کو اپنا فریضہ سمجھ رہے تھے اور اپنی پھوپھی کو قسم
دے رہے تھے کہ ہمیں نہ روکیں اور ——————

چچا تک پہنچ کر ان کا دفاع کرنے دیں۔

ان شہیدوں میں سے اکثر تو سالہا سال سے امام حسینؑ کی آمد کا

انتظار کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ تشریف لائیں تو ان کے زیرِ رکاب رہ کر اپنی شہادت کی آرزو پوری کریں۔

وہ تمام محرومیوں اور ناکامیوں کا سامنا کر رہے تھے، تکلیفیں اور سختیاں برداشت کر رہے تھے کہ کسی طرح حسینؑ کی زیارت نصیب ہو اور یہ دن آجائے۔

یہ سب طرح طرح کی چھلنیوں سے چھنے ہوئے، مختلف کسوٹیوں پر کسے ہوئے اور آزمائش کی بھٹیوں میں تپائے ہوئے اور ان میں سے بالکل خالص ہو کر نکلے ہوئے تھے۔

ان کے لیے کیسی کیسی چھلنیاں تھیں، کیسی کیسی کسوٹیاں تھیں اور کیسی کیسی بھٹیاں تھیں یہ تاریخ بتائے گی۔

شہیدوں کے درمیان وجہ مشترک

شمع وجودِ حسینی کے پروانوں میں بہ لحاظ رنگ و نسل، شکل و صورت، سن و سال اور لہجہ و زبان کوئی مشابہت و مماثلت نہ تھی۔

سیاہ پوست غلام ایک سفید فام آزاد کے ہم پہلو تھا۔

ہاشمی جوان ایک دوسرے قبیلے کے پیر اور مرد کے ہم قدم اور ہمراہ نظر آرہا تھا۔

ایک مردِ عرب، ایک مردِ ترک یا مردِ فارس کے برابر کھڑا تھا اور ان کا سن اور ان کی عمریں بھی عام فوجیوں کی طرح کسی نظام کے ماتحت یکساں نہ تھیں۔ کچھ پیر تھے کچھ میانہ سال، کچھ نوجوان تھے کچھ خرد سال کچھ جوان تھے کچھ بڑے بوڑھے۔

مگر جس چیز نے ایک کو دوسرے سے قریب کر دیا اور جو
شے ان سب کے درمیان وجہ مشترک بنی وہ تھا ——————
ایمان ، اعتقاد ، اتحاد ، اخوت ——————
انسانیت کو پیغام دینا ، الٰہی فرائض ، اسلام اور قرآن
کی حمایت اور نصرت اور مستضعفینِ عالم کو ظلم سے نجات دلانا۔
ان لوگوں نے خود کو دین پر قربان کر دیا ، دین کو خود پر یا اپنی
خواہشات پر قربان نہیں کیا۔ اپنے خون سے اسلام کی آبیاری کی اور اس میں
حیاتِ تازہ دوڑائی ۔ یہ نہیں کیا کہ اسلام کو بھینٹ چڑھا کر اپنے اندر زندگی کی
روح دوڑائیں۔
ان لوگوں کی زبان پر نہ کبھی کوئی ناروا الفاظ آئے نہ ان کے ذہنوں میں
کبھی کوئی غلط خیال آیا۔ انھوں نے دین کو کبھی کھیل کا میدان نہیں بنایا۔
یہ لوگ اپنا فریضہ سمجھتے تھے کہ ——————
شخصی مفاد کو اجتماعی مفاد پر قربان کر دیں۔
ان شہیدوں کا یہ عمل بتا رہا تھا کہ ابھی ملتِ اسلامیہ میں کچھ لوگ
ایسے ہیں کہ جنھیں صرف ایمان اور عقیدہ کا رابطہ ایک جگہ جمع کر دے گا۔
ابھی کچھ لوگ ایسے ہیں ——————
جو احیائے اسلام اور قرآن و سنت کے مقصد کے لیے
ایک ساتھ ہو جائیں اور اس مقصد کی خاطر تمام اختلافات اور تمام تفرقوں کو
بھلا دیں ——————
اور حد یہ ہے کہ ہم شہیدوں نے دنیا کو بتا دیا کہ اب بھی کچھ بچے
ایسے ہیں جو بڑوں اور بزرگوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکیں۔ حقائق

کو سمجھیں اور دشمن کے مقابلہ میں کھڑے ہو جائیں۔
یہ وہ امور ہیں کہ جس کی نظیر نہ دنیا کی تاریخ میں ملے گی اور نہ خود تاریخِ اسلام میں۔

وہ چیزیں جن کی وجہ سے ان شہیدوں کا کام اور زیادہ رنگین ہو گیا

ایمان و اعتقاد اور اپنے مقصد اور فریضے سے وابستگی کے علاوہ بھی ان میں چند چیزیں ایسی تھیں جس نے ان کے عمل کو اور زیادہ رنگین اور موثر تر بنا دیا اور یہ کسی جہاد کسی دفاع اور کسی معرکے میں نظر نہیں آتیں۔
اور وہ مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ شوقِ شہادت

اصحابِ حسینؑ اپنے شدتِ صفا و اخلاص اور فرط ایمان و اعتقاد کی بنا پر شہادت کے عاشق تھے۔
ایسے عاشق جو وصالِ محبوب کے لیے بیتاب ہو اور اس کے لیے ہر رنج و مصیبت کو برداشت اور قبول کرلے۔
کبھی انسان کا مقصد اپنے فریضہ کی انجام دہی ہوتا ہے اور اس کے لیے کوشش کرتا ہے مگر بس اسی حد تک کہ فریضہ انجام پا جائے اور ذمہ داری اٹھ جائے۔
اور کبھی اس کو عشق ہوتا ہے اور کام کی دھن ہوتی ہے اور اس دھن میں انسان کو اپنے سر پیر کی خبر نہیں رہتی۔ بے اختیاری اور بے قراری کے

ساتھ دوڑ دھوپ اور کوشش کرتا ہے۔

اصحابِ حسینؑ ایسے ہی تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ قربۃً الی اللہ صرف اپنے فریضہ کو انجام دیں ——

بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنے فریضہ اور اپنی ذمہ داری سے بڑھ کر جد وجہد کریں اور اس کے لیے عشق اور دلی لگن کی ضرورت ہے۔

اگر ہم یہ کہیں کہ ——

ہمارے ساتھی آج تک صرف شوق شہادت میں زندہ رہے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ واقعاً اگر ان میں یہ شوق اور یہ امید نہ ہوتی تو اس بے سروسامانی کو دیکھتے ہوئے کبھی کے مرچکے ہوتے۔

یہ لوگ حسینؑ کے عاشق تھے اور ان پر جان قربان کردینا ان کا مقصد تھا جس طرح پروانے شمع کے گرد چکر لگاتے ہیں اسی طرح یہ لوگ بھی حسینؑ کے گرد گردش کررہے تھے۔

میدانِ کربلا میں شہادت کے لیے ہر ایک سب سے پہلے جانا چاہتا تھا۔ ہر شخص کی یہی خواہش تھی کہ سب سے پہلے اسے اجازت ملے اور وہ —— قربان گاہ کی طرف جائے اور اپنی جان نثار کرے۔

یہ لوگ دشمن کے تیروں کی بارش کو اپنے سینوں پر روکتے "تاکہ حسینؑ تک نہ پہنچ سکیں۔

حسینؑ نے ظہر کی نماز میدان میں پڑھی تو اپنے سینوں کو سپر بنا کر سامنے کھڑے ہوگئے "تاکہ زہراؑ کا لال محفوظ رہے اسے کوئی زخم نہ آئے۔

کبھی کبھی یہ لوگ بغیر زرہ و بکتر، پتھروں، تیروں اور تلواروں کے مقابل کھڑے ہوجاتے جیسے معلوم ہوتا کہ انھیں زخموں کی کوئی تکلیف

نہیں ہوتی۔ یہ لوگ جان دینے کے لیے اس طرح شیفتہ اور فریفتہ تھے کہ گویا ان کے نزدیک لفظ مرگ کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔

ہم تاریخ اسلام اور خاص کر پیغمبر اسلامؐ کے جہاد میں بھی انھیں جیسے چند افراد کو پاتے ہیں جیسے حضرت خثیمہ اور ان کے فرزند نیز عمرو بن جموح لنگ مگر ان میں بھی وہ عشق اور شیدائیت نہ تھی جو اصحابِ حسینی میں تھی۔

خود ہمارے رہبر انقلاب امام حسینؑ نے فرمایا کہ

"میں نے اپنے اصحاب سے زیادہ باوفا کسی کے
اصحاب کو نہیں پایا۔"

۲۔ قوتِ روحانی

ہمارے رفقا اور ساتھی اپنے مقصد کے حصول اور اپنے پروگرام پر عمل میں کبھی مضطرب اور پریشان نہیں ہوئے۔ ان کا ارادہ کبھی کمزور و متزلزل نہیں ہوا، اگرچہ دریا کی طرح موجیں مارتی اور ہر طرح سے مسلح اور آراستہ دشمن کی فوج ان کو گھیرے ہوئے تھی لیکن اِن کی ہر بات اور ان کا ہر عمل دشمنوں کے لیے شمشیر قاطع تھا۔

انھوں نے دشمنوں سے کبھی خوشامدانہ باتیں نہیں کیں۔ ان کے تیور یہ کہتے تھے کہ ہم مرد ہیں، ہم قتل کو اپنے لیے عار نہیں سمجھتے۔

عار و ننگ تو وہ لوگ سمجھتے ہیں جو تن پرور اور ذلت گوارا کرنے والے ہیں۔ ہمارا خون تو صرف تلوار کی دھار سے بہے گا اور کسی اور چیز سے نہیں ——— ہماری موت بہادروں کی موت ہو گی۔ ہم لڑتے ہوئے بہادری کے ساتھ مریں گے۔ اپنے گھر میں بستر پر مرنا، کمزوری اور زبوں حالی کی دلیل ہے۔

یہ لوگ بہت قوی دل اور طاقتور تھے۔

دل میں شوق لقائے الٰہی ——————

ذہن میں یہ خیال کہ جنت میں پہنچ کر رسول مقبولؐ کے مہمان ہوں گے اور دل میں نجاتِ امت کی آرزو۔ اس لیے جس قدر جنگ کے شعلے زیادہ بھڑکتے۔ اور ان پر چار جانب سے حملے سخت سے سخت تر ہوتے، ان کے چہرے اور سرخ ہو جایا کرتے۔ اور یہ مقابلہ بھی سخت سے سخت کرتے۔ میدان میں بے دھڑک تلوار چلاتے اور دشمن کی تلواروں کا سختی سے مقابلہ کرتے۔

عمر سعد نے خود اقرار کیا کہ ——————

"یہ کوئی عام اور معمولی لوگ نہیں تھے۔ ان میں سے ہر ایک شخص ایک غضب ناک شیر تھا۔ جب یہ ہماری صفوں میں در آتے تو ہمارے سپاہی لومڑیوں کی طرح ادھر ادھر بھاگتے اور راہ فرار اختیار کرتے تھے۔"

ہاں یہ ان کی روحانی طاقت ہی تو تھی کہ انھوں نے دشمن کی اتنی بڑی فوج سے ٹکر لی۔ اور ان کے دلوں پر اپنی ایسی ہیبت اور دہشت بٹھا دی کہ جسے یاد کر کے دشمن لرزہ براندام ہو جاتا تھا۔

اسی روحانی قوت کی بنا پر تو ان لوگوں نے کفر و بے دینی، دروغ اور مکر و خیانت کے پھندوں سے اپنا گلا چھڑایا اور جان دے دی۔

۳۔ مقصد و نصب العین۔

گروہ حسینی اپنا ایک مقصد رکھتا تھا۔ اس کی جڑیں مضبوط تھیں۔ انھوں نے تو ہنگام گیر و دار میں بھی اپنے مقصد کو فراموش نہیں کیا اور یہ ان کے کمال شجاعت کی دلیل ہے۔

یہ لوگ اپنے مقصد کے حصول کی راہ میں بے حد بہادر تھے۔ وجہ یہ تھی کہ یہ مختلف آزمائشوں کی بھٹیوں میں سے تپ کر نکلے تھے۔ پھر بھی ان کا رنگ پھیکا نہیں پڑا تھا۔

ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ شہادت کے ذریعہ جنّت کے درجاتِ عالیہ تک پہنچیں اور وہاں کی نعمتوں سے متنعم ہوں۔ بلکہ ان کا مقصد صرف رضائے الٰہی حاصل کرنا تھا۔ ان کے پیش نظر صرف اطاعتِ امرِ مولا تھا۔

ان کی خواہش صرف شہادت ہی نہیں بلکہ اس سے بھی بالاتر شے کی تھی وہ انصاراللہ اور انصار دین اللہ کی فہرست میں اپنا نام شامل کرنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس قابل ہو جائیں کہ زبان معصومؑ سے

بِاَبِیْ اَنْتُمْ وَاُمِّیْ کے الفاظ سُن لیں اور معصومؑ

ان کے عمل کو بے کم و کاست صحت کی سند دے دے۔

ان کا مقصد صرف اپنے فریضہ کی ادائیگی اور اپنی ذمہ داری کو پورا کرنا نہ تھا۔ یاد کیجیے زہیر قین کا قول کہ ——————

" اگر ہم ہزار بار قتل کیے جائیں اور پھر زندہ کیے
جائیں تو بھی ہم آپؑ کا اور آپؑ کے خاندان کا
دفاع کریں گے اور رسولؐ کی امانتوں کی حفاظت
اور نگہبانی سے باز نہ آئیں گے ..... "

حالانکہ اگر مقصد صرف فریضہ کی ادائیگی ہوتا تو صرف ایک بار قتل و شہید ہونا کافی تھا۔

ہاں! یہ لوگ یہی مقصد لیے ہوئے تھے اور یہی سوچ اور سمجھ کر انھوں نے

دشمنوں کا مقابلہ کیا، میدان میں گئے۔ جنگ کی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، مگر اپنے نظریۂ اسلامی کو پاش پاش ہونے سے بچایا۔ ہاتھ کٹ گئے مگر حمایت دین سے دست کش نہیں ہوئے۔

پیاسے رہے مگر درختِ اسلام کو اپنے خون سے سینچا، اور اسے خشک نہ ہونے دیا۔

شبِ عاشور

عاشور کی رات قیامت کی رات تھی۔ اس میں ہم لوگ اپنی اپنی قربانیوں کا پروگرام مرتب کر رہے تھے۔

یہ رات درحقیقت ——————

چھٹائی اور صفائی کی رات تھی، آزمائش کی رات تھی۔

وہ لوگ جو عہدہ و منصب کی لالچ میں ہمارے ساتھ ہوئے اور رہے تھے، آج کی رات وہ ہم سے جدا ہو گئے اور ساتھ چھوڑ کر چل دیے۔

وہ لوگ جو پیسے اور مال غنیمت کی امید میں ہمارے ساتھ مدینے سے مکہ اور مکہ سے کربلا آئے تھے انھوں نے بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔

اب صرف ہم لوگ رہ گئے تھے ——————

اگرچہ ہم لوگوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ مگر سب ایک دل تھے۔ ایک عزم رکھتے تھے۔ سب کا مقصد ایک، سوچ ایک۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد ہم سب کے سامنے ایک روشن و معین مقصد تھا۔ ایک ہی عزم و ارادہ تھا۔ ہم لوگوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے پروگرام مرتب کیا۔ اور انسانیت کے معیار سے قریب اور قریب تر ہوتے گئے۔

یہ صرف اور تنہا عاشورا کی رات تھی جس میں ایک چھوٹا سا معاشرہ ایسا بنا جس کا مقصد ایک ——— ارادہ ایک ——— آرزو ایک ——— نفاق و اختلاف سے دور ———

سب متحد، سب ایک دل اور ایک زبان تھے۔ سب سے خلوص و انسانیت کا اظہار تھا۔ کاش وہ لوگ بہت پہلے ہی ہمارا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے ہوتے۔

یہ رات اتحاد کی رات تھی ——— یکجہتی کی رات تھی ——— باہمی خلوص کی رات تھی ——— اپنی زندگی کی آخری رات تھی ——— مثالی زندگی کی رات، جس میں ہم نے اسلام کی مثالی زندگی کا لطف حاصل کیا تھا۔ ایک دوسرے کی زبان کو سمجھا تھا، ایک دوسرے کے درد کا احساس کیا تھا۔

معاشرہ کے مثبت و منفی نقاط ہمارے لیے قابلِ لمس ہو چکے تھے ہم اسلام کو محسوس کر رہے تھے۔ اپنے پہلو میں دیکھ رہے تھے، اسے لمس کر رہے تھے، اس کے پیکر کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

اور اب از سرِ نو احساس کر رہے تھے کہ ———

ذمہ داری کیا چیز ہے، فریضہ کس کو کہتے ہیں، کسی کے دکھ درد میں شریک ہونے کے کیا معنی ہیں اور اس میں کتنی مٹھاس اور کتنی حلاوت ہوتی ہے ———

اخوت کیا ہے، مساوات کیا شے ہے، زندگی کا مفہوم کیا ہے، انسان زندہ رہے تو کیوں، مرے تو کیوں، اپنی جان دے تو کیوں اور کس مقصد کے لیے وغیرہ وغیرہ۔

شبِ عاشور ہم لوگوں کے لیے مسرت کی شب بھی تھی اور رنج و حسرت

کی شب بھی تھی۔ مسرت اس لیے تھی کہ آج کی شب ہم لوگوں نے حقیقی انسانیت کی اور سچی اسلام کی زندگی پالی تھی۔ اور اپنے ایک چھوٹے سے معاشرے کی ذمہ داریوں اور فرائض کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔

کسی کے ذمہ پہرہ دینا تھا ——

کسی کا کام خندق کھودنا تھا،

کوئی لکڑیاں فراہم کر رہا تھا، کوئی کچھ کر رہا تھا اور کوئی کچھ۔ اپنے اپنے کاموں سے فراغت کے بعد عبادت میں مشغول ہوئے اور بارگاہِ ذوالجلال میں مناجات شروع کی ——

سبحان اللہ!

کیا خلوص تھا۔ تمام اندیشوں اور رنج و ملال سے دور ہو کر اپنے معبود سے راز و نیاز کی باتیں تھیں۔

کیا صفائے قلب تھا، کیا عبادت تھی ——

اور خدا اور اس کے بندوں کے درمیان کیا ربط تھا۔

مترنم آواز میں دعائیں تھیں —— قیام تھا —— قعود تھا —— رکوع تھا، سجود تھا —— تسبیح تھی اور اس رات کی صبح ہونے کا انتظار تھا۔

شبِ عاشور ہم لوگوں کے لیے رنج و ملال کی شب بھی تھی۔

ملال اس کا کہ اب تک ہم لوگوں کو ایسی زندگی کیوں نہ نصیب ہوئی جو آج کی شب ہے ——

رنج اس کا کہ آج تک جو کچھ ہم لوگوں نے کیا وہ کیا تھا؟

اگر آج کی شب کی زندگی کو ہم زندگی کہیں تو پھر اس سے پہلے کی زندگی کا کیا نام رکھا جائے —— زندگی —— ؟ شبہ زندگی —— ؟ ادائے زندگی؟

یا مرگِ تدریجی ——————؟

رنج و ملال اس کا کہ ——

آج تک ہم لوگ اپنے ان جیسے دوستوں سے واقف کیوں نہ تھے اور اس مثالی زندگی سے ہم لوگ آج تک دُور کیوں رہے ؟

عاشور کی شب ہم لوگوں کے لیے تیاری کی شب تھی ——

آمادگی کی شب تھی —— جانبازی کے لیے آمادگی اقدام کے لیے آمادگی —— جان دینے کے لیے آمادگی ۔

یہ شب اس لیے تھی کہ ہم لوگ اپنے جی کو ہلکا کرلیں، ہر ایک سے رخصت ہولیں ۔ حرص، ہوس، مال، دولت، خاندان، اولاد، املاک، تمسکات، غرض جو کچھ ہمارے دل میں ہے ان سب سے چھٹکارا حاصل کریں اور اپنے تمام امور اللہ کے سپرد کردیں ——————

اور خود فارغ البال ہو جائیں ——

تاکہ بے فکر ہو کر اپنے اپنے فریضے کو ادا کریں اور اپنی معینہ راہ پر اچھی طرح چل سکیں۔

صبح عاشورا

ہمارے اکثر احباب رات بھر بیدار رہے، عبادت کرتے رہے خیموں کی پاسبانی اور نگہبانی کرتے رہے ۔ نمازِ شب پڑھتے رہے، قرآن کی تلاوت کرتے رہے، اپنی عورتوں، بچوں کی دلجوئی کرتے رہے، انھیں ڈھارس دلاتے رہے ۔ ان کا دل گرما رہے تھے تاکہ وہ پیغامِ حق پہنچانے کا بار اٹھانے کے قابل ہو جائیں —————— یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

صبح نمودار ہوئی اور پیغامِ حق پہنچانے کے حساس لمحات آگئے۔ اپنی زندگی کی آخری نمازِ صبح ہم لوگوں نے جماعت کے ساتھ امام حسین علیہ السلام کی اقتدا میں ادا کی ——————

سبحان اللہ!

وہ کیا نماز تھی اور کیا جماعت —— بوڑھے، جوان، بچے، نوجوان، سب قدم سے قدم ملائے ہوئے۔

اور ہم میں سے بعض کے لیے تو یہ زندگی کی بالکل آخری نماز تھی۔ اس لیے کہ ظہر تک تو وہ درجۂ شہادت پر فائز ہو چکے تھے۔ نمازِ ظہر و عصر کے وقت تک وہ زندہ کب رہ سکے۔

نماز صبح کے بعد ہم لوگوں نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے اور مناجات شروع کی اور اپنے پروردگار سے عرض کیا کہ

بارِ الٰہا! تو اس فریضہ کی انجام دہی میں ہم لوگوں کی مدد فرما۔ ہم لوگ تجھ سے نصرت کے طالب ہیں۔

ہمارے امامِ جماعت حسینؑ نے بھی دعا کی:

اَللّٰھم انت ثقتی فی کل

کرب ورجائی فی کل شدۃ

پروردگار! میں ہر مصیبت میں تجھ پر بھروسہ کرتا ہوں اور سختی کے موقع میں تجھ سے آس لگاتا ہوں۔ میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں مجھے سوائے تیرے اور کسی کی ضرورت نہیں۔

نماز صبح کے بعد ہم لوگوں نے بھی صف بندی کی۔ میمنہ و میسرہ کی

ترتیب دی ، قلبِ لشکر کی تشکیل کی اور جان دینے کے لیے تیار ہو گئے ۔
میدان خالی نہیں چھوڑا کہ دشمن ہماری قلتِ تعداد پر طعنہ زنی کریں
اسی لیے ہمارے مولا نے فرمادیا تھا کہ

والی زاحف الیکم بھذا الاسر

ہم وہ نہیں کہ تمھاری کثرتِ فوج سے ڈر جائیں ، دیکھو یہ ہماری فوجِ قلیل جو ایک خاندان کے برابر ہے میں اسی خاندان کے ساتھ تمھارے لاکھوں کا مقابلہ کروں گا ۔

دشمن نے مہلت اس امر کی بھی نہ دی کہ ہم لوگ پوری طرح اپنی صفوں کو آراستہ کر لیتے ۔ عمر سعد نے حکم دیا اور ہم لوگوں پر تیروں کی بارش شروع ہو گئی مگر ہم لوگوں نے پشت نہیں دکھائی بلکہ اپنے سینوں کو سپر بنایا ۔
چنانچہ اس پہلے ہی حملے میں ہمارے جوانوں میں سے بہت سے شہید ہو گئے ۔ مگر خوش قسمتی سے خیموں کو کوئی گزند نہیں پہنچا ۔ کیونکہ ایک طرف تو ہم لوگ خیموں کو اپنی پشت کی طرف لیے ہوئے تھے اور دوسری طرف خیموں کی حفاظت کے لیے خندقوں میں آگ روشن کر رکھی تھی اور پھر عورتوں کی بھی ہمت بندھائے ہوئے تھے ۔ اس لیے کہ انھوں نے کبھی معرکۂ جنگ نہیں دیکھا تھا ۔ خصوصاً چھوٹے چھوٹے بچے ان دشمنوں کے حملوں کو کب دیکھ سکتے تھے اور خاص کر ایسے دشمنوں کے حملے کو جو بوڑھے ، جوان ، کمسن اور بچے میں فرق نہیں کر رہے تھے ۔

ہمارے دشمن کیسے لوگ تھے

اسے تو جانے ہی دیجیے اور یہ نہ پوچھیے کہ ہمارے دشمن ، ہم سے

مقابلہ کرنے والے ، ہم سے جنگ کرنے والے کون تھے اور ان کی خصلتیں کیا کیا تھیں ——— ؟

کاش !

کربلا میں تم خود ہوتے اور ان کے مسخ شدہ چہرے ، ان کی سنگدلی اور سیاہ قلبی ، ان کی وحشیانہ حرکات کا خود مشاہدہ کر لیتے۔

یہ سب کون تھے ——— ؟

معلوم ہوتا تھا کہ یہ سارے دیوانے اور پاگل تھے جو قید سے چھوٹے ہیں۔ یہ سارے دیوانے اور پاگل تھے جنھوں نے اپنی زنجیریں توڑ ڈالی ہیں۔ یہ سب پیسے اور عہدہ و منصب ، مال و دولت کے لالچی تھے۔

یہ ایسے تھے کہ ———————

چند درہم پانے کی ہوس میں جسے کہیے قتل کر دیں ، یہ بھی نہ دیکھیں اور سمجھیں کہ ہم کس کو قتل کر رہے ہیں۔ کسی نے ذرا تعریف کر دی اور یہ اپنی انسانیت اور شرافت سب کچھ اس پر نچھاور کرنے کے لیے تیار۔

کسی نے ذرا شاباش کہا یا ڈانٹ کر کہا اور یہ لکڑی اور پتھر لے کر ہم پر یا ہر اس شخص پر جسے مارنے کا حکم ملا ہے ، حملہ کرنے کے لیے آمادہ۔

ہم لوگوں کے قتل و تشدد پر جن لوگوں کو مقرر کیا گیا تھا وہ درحقیقت مامور و محکوم تھے۔ اور مثل مشہور ہے : "المامور معذور" محکوم تو معذور ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے صرف اپنے "امیر المومنین یزید" اور اپنے "اولی الامر ابنِ زیاد و شمر و عمرِ سعد" کے حکم پر ہمارا خون بہا دیا۔

کربلا میں اس لیے آئے کہ ———————

انسانوں کو قتل کریں۔ اور وہ بھی کن انسانوں کو ———

اولادِ رسولؐ اور خاندانِ علیؑ کو۔

یہ لوگ عہدہ اور منصب کے خواہاں تھے اور چاہتے تھے کہ حکومت کی طرف سے کہیں کی فرمانروائی، کسی کی دربارداری یا کسی مقام کی تولیت ان کو حاصل ہو جائے اور اس کے لیے انھوں نے آدم کشی کو ذریعہ بنایا۔

یہ وہی لوگ تھے کہ جن کے دلوں سے ابھی تک محمدؐ اور علیؑ کی دشمنی نہیں نکلی تھی۔ حالانکہ ان لوگوں نے محمدؐ و علیؑ کو اپنی آنکھوں سے کبھی دیکھا بھی نہ تھا ــــ مگر ان سے اپنے کینہ اور دشمنی کی آگ کو بجھانے کے لیے انھوں نے اولادِ رسولؐ کو گھیر لیا اور چاہتے تھے کہ ان لوگوں کا انتقام ان کی اولاد سے لیں۔

یہی وہ زخم خوردہ، نیم مردہ سانپ تھے جو دورِ خلفاء اور حکومتِ بنی امیہ میں تازہ دم اور جاندار بن گئے تھے اور اب انھوں نے اپنے پھن اٹھائے تھے اور اولادِ رسولؐ کو ڈس رہے تھے۔

ان میں کچھ عابدانِ جاہل بھی تھے جو "بلعم باعورِ وقت، مفتی دیارِ بنی امیہ یعنی قاضی شریح کے فتوے پر عمل کرتے ہوئے فرزند رسولؐ امام حسینؑ سے اپنا فریضہ مذہبی سمجھ کر قربۃً الی اللہ جنگ کر رہے تھے ــــــ

اور پھر ان کو قتل کر کے سجدۂ شکر ادا کر رہے تھے، نمازیں پڑھ رہے تھے، مسجدیں تعمیر کر رہے تھے۔

حیرت ہے کہ ــــــــ

توحید پرستی جن کا ہمیشہ سے شعار تھا، آج وہ ایسے پست فطرت لوگوں میں گھر گئے اور جن لوگوں کی بنیاد فتنہ و فساد سے ہمیشہ معرکہ آرائی تھی آج ان کو انھیں فسادیوں نے گھیر لیا تھا۔

ان پست فطرت اور بداعمال دشمنوں نے ہم لوگوں کے خون بہانے اور ہمیں مٹانے کے لیے کسی اقدام سے گریز نہیں کیا۔

یہ اپنے چہرے پر اسلام کی نقاب ڈال کر خود کو دیندار اور مذہبی اور ہمیں ساری امتِ مسلمہ میں خارجی، ملحد، کافر، مشرک، مفسد، اور تخریب کار مشہور کرتے اور یہ نہ سمجھتے کہ ——————

اگر حسینؑ فرزندِ رسولؐ ہی خارج از اسلام ہیں ——

—————— تو پھر اسلام میں داخل کون ہے ؟

اور اگر حسینؑ ہی فساد برپا کرنے والے ہیں ——

—————— تو یزید کا عمل کیا ہے ؟

دشمن کی فرومایگی

ہمارے دشمن حد درجہ پست فطرت اور کمینے تھے اور یہی کمینگی ان کی عاجزی، بزدلی و درماندگی کی دلیل تھی۔ ان کی کمینگی کی انتہا یہ تھی کہ انھوں نے ہم پر اور ہمارے بچوں پر پانی بند کر دیا تاکہ ہم لوگ پیاسے مرجائیں اور انھیں جنگ نہ کرنی پڑے۔

انھوں نے اس بیوہ عورت کو بھی قتل کر دیا جو اپنے شوہر کی لاش پر بیٹھی ہوئی آہ وزاری کر رہی تھی۔ اس ماں کو کھینچ کر الگ کر دیا جو اپنے فرزند کی پارہ پارہ لاش پر بین کر رہی تھی اور پھر اس کے فرزند کا سر کاٹ کر ماں کی طرف پھینک دیا ——————

شیر خوار بچے کی گردن تک کو تیر کا نشانہ بنایا۔ انھیں ہمارے چھوٹے چھوٹے بچوں پر بھی ترس نہ آیا۔ ان کی وحشت اور درندگی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

ہم لوگ ایسے وحشی، سفاک اور سنگدل گروہ سے مقابلہ کر رہے تھے۔ یہ ایسے وحشی تھے کہ جب دیکھا کہ ——————

ایک کے مقابلہ میں ایک کی جنگ میں برابری کرنا ممکن نہیں تو حکم دے دیا کہ ساری فوج بیک وقت حملہ کرے۔

یہ وہ وقت تھا جبکہ ہمارے مولا و آقا میدان میں تنہا رہ گئے تھے۔ ادھر ہزاروں کی فوج ان کا محاصرہ کیے ہوئے تھی۔ ایک طرف سے پتھر برسائے جا رہے تھے تو دوسری طرف تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔

ہزاروں کی فوج صرف ایک تن تنہا پر ٹوٹی ہوئی، اس کا خون بہانے کے لیے آمادہ —————— حالانکہ یہ عرب کی حمیّت اور اس کے آدابِ جنگ کے بالکل خلاف تھا کہ ——————

ایک شخص کو گھیر کر بہت سے لوگ ماریں۔

یہ لوگ ایسے وحشی اور درندہ صفت تھے کہ ——————

انھوں نے ہم لوگوں کو ہر طرح سے مجبور اور بے دست و پا کر کے قتل کیا اور اسی کو "قتلِ صبر" کہتے ہیں جو نہ اسلام میں جائز ہے اور نہ زمانۂ جاہلیت میں جائز سمجھا جاتا تھا۔ وہ بھی کوشش کرتے تھے کہ اس طرح کسی کو قتل نہ کریں اور اگر کسی نے ایسا کیا تو وہ سب سے زیادہ درندہ اور وحشی سمجھا جاتا تھا۔

ان لوگوں کی وحشت اور درندگی اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ ——

—————— انھوں نے قتل کے بعد ہم لوگوں کی لاشوں کو بھی اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اور ان پر گھوڑے دوڑائے۔ انھیں پامالِ سمِ اسپاں کیا تاکہ ——————

ہماری لاشوں کا بھی کوئی پتہ اور نشان نہ رہ پائے۔

یہ لوگ ایسے پست فطرت اور کمینہ واقع ہوئے تھے کہ ——
ہم لوگوں کی زندگی ہی میں ہماری عورتوں کے خیموں تک
پہنچنے کے لیے مسلسل حملے کرتے رہے۔
چنانچہ ایک مرتبہ ——————
ان کے سردار شمر نے آگے بڑھ کر خیمے پر اپنا نیزہ چبھویا،
اور عورتوں اور بچّوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے بآواز بلند پکار کر کہا کہ
"آگ لاؤ!
تاکہ میں ان خیموں میں آگ لگا دوں۔"
اس بے رحم کی یہ آواز سُن کر عورتیں اور بچّے روتے پیٹتے اپنے
خیموں سے باہر نکل آئے۔
یہ لوگ اس حد تک پست اور کمینہ فطرت تھے کہ ——
ہم لوگوں کے جیتے جی ہی ہمارے خیموں کو لوٹنے کے لیے
بار بار حملے کرتے رہتے مگر ہم لوگ انھیں مار کر پیچھے بھگا دیا کرتے۔
ابن سعد اپنی فوج کو مسلسل حکم دیتا رہتا کہ ——
"آگے بڑھو اور ان خیموں میں آگ لگا دو۔"
اور ہم لوگ اپنا اور اپنے خاندان والوں کا دفاع کرتے
رہتے اور ان اشقیا کی سرزنش کیا کرتے تو کبھی وہ مارے شرم کے پیچھے ہٹ
جاتے —— ہاں ہاں شرم کے مارے۔
یہ دشمن بڑے سفاک اور شقی القلب تھے۔
انھوں نے ہم پر پانی بند کر دیا۔ ہمیں پیاسا رکھا۔ اور
ہر طرح کی سختیاں کیں۔ اگر بالفرض ہم لوگ ان کی نگاہوں میں گناہگار تھے۔

تو آخر ہمارے بچّوں، ان کی عمر رسیدہ ماؤں، ان عورتوں اور ان بیماروں کا کیا قصور تھا ——————؟

ان لوگوں نے ہمارے بچّوں کو کیوں قتل کیا۔ ہمارے کمسنوں پر کیوں نہیں ترس کھایا۔

یہ لوگ حامیانِ دینِ محمدؐ اور حافظانِ شریعت و امرِ رسالت کو خارجی اور خارج از اسلام کہہ رہے تھے۔

اگر ہم لوگ خارجی تھے اور خارج از اسلام تھے ——————

تو پھر ایسی صورت میں ——————

کیا شمر و سنان و یزید یہ سب پیروِ دینِ محمدؐ تھے؟

کیا دینِ محمدؐ میں یہ جائز ہے کہ عورتوں کے خیموں میں اور وہ بھی ان کے مردوں کو قتل کرنے کے بعد آگ لگا دی جائے۔

یہ اور اس طرح کی سیکڑوں باتیں اس امر کا پتہ دیتی ہیں کہ یہ لوگ کس قدر کوتاہ اندیش، کوتاہ نظر، بدخواہ و بدکار، پست طبع و پست ہمت تھے ——————!

اور ہم لوگوں کے فخر کے لیے یہی کیا کم ہے کہ ہم نے ایسے گرے ہوئے لوگوں کا مقابلہ کیا اور انھیں آیاتِ قرآنی پڑھ پڑھ کر سنائیں۔

ہمارے رفقا دشمن کے مقابلہ میں

ہمارے ساتھی اور جانباز، دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے بھی اتنے متحمل اور اتنے صابر تھے کہ اس خونیں، خوف ناک اور دل ہلا دینے والے معرکہ میں بھی ہمت نہیں ہارے۔ برابر مقابلہ کرتے رہے اور اپنے مقصد کو سامنے رکھا۔

اس دن جبکہ برق کی طرح چمکتی ہوئی تلواریں آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں
جبکہ نیزوں کی اَنیاں جسموں میں پیوست ہو رہی تھیں۔ ہمارے جانبازوں میں
سے چند ایسے تھے جو بغیر زرہ و بکتر میدان میں پہنچے اور ——————
انتہائی خلوص اور عقیدت کے ساتھ اپنی جان نچھاور کر دی۔
ہمارے رفقار دوسروں کی طرح کوئی سیاسی لوگ نہیں تھے کہ اپنے
مقصد کے خلاف کوئی قدم اٹھاتے۔
دیکھنے میں آتا ہے کہ ——————
سیاسی لوگ حالات و حادثات کے سامنے طرح طرح کے
رنگ اختیار کرتے ہیں۔ اپنی صورت و سیرت کو بدل لیتے ہیں۔ مگر ہمارے ساتھی ایسے
نہیں تھے۔ انھوں نے دشمن کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا۔
وہ امان دینے کو تیار تھے مگر انھوں نے قبول نہیں کیا۔
ان کے تیروں اور تلواروں سے ہراساں نہیں ہوئے۔ بلکہ ان تیروں اور تلواروں
کے سامنے اپنے سینوں کو سپر بنا دیا۔
ہمارے ساتھی اس میں شک نہیں کہ بڑے صابر تھے۔ دشمن کا مقابلہ
اور اس میں ثابت قدمی ان کا خاص شیوہ تھا۔ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے
اپنے امامؑ کو چھوڑ کر ان بے ایمانوں اور ظالموں سے نہیں ملے۔ جنگ سے
کنارہ کش نہیں ہوئے۔ تلواریں کھائیں، جان دے دی مگر اس پستی، ذلت
اور ننگ و عار کو قبول نہیں کیا۔

ہمارے رفقار بارگاہِ حسینؑ میں

ہمارے رفقار سروِ آزاد کی طرح سربلند تھے۔ انھوں نے اگر سر جھکایا

تو صرف اپنے آقا حسینؑ کے سامنے۔

یہ لوگ نورِ حسینیؑ سے روشنی حاصل کرتے ——————
اور زندگی بسر کرتے تھے۔

یہ لوگ امامؑ کے گرد اس طرح تھے جیسے آفتاب کے گرد چاند اور ستارے جو اس سے کسبِ ضیا کرتے ہیں۔ جس طرف امامؑ چلا یہ بھی چلے اور جب امامؑ ٹھہر گیا تو یہ بھی ٹھہر گئے۔

درحقیقت مولا حسینؑ ہم لوگوں کے امام، پیشوا اور مقتدا تھے۔ اور ہم لوگ ان کے ماموم، پیرو اور مقتدی تھے۔ لیکن دنیا میں آجتک کسی نے اپنے پیشوا کی اقتدا اس طرح نہیں کی جیسی ہم لوگوں نے کی ——————
اور دنیا کے کسی پیشوا نے اپنے پیروؤں کا اس طرح ساتھ نہیں دیا جیسا کہ حسینؑ نے دیا۔

کربلا میں امام و ماموم، پیشوا اور پیرو، مقتدا اور مقتدی دونوں پیاسے رہے، بھوکے رہے اور اسی حال میں جنگ کرتے رہے۔

امامؑ اور ماموم باہم آپس میں ہدایت دیتے اور لیتے اور حق کا پیغام پہنچاتے رہے ——— امامؑ اور ماموم دونوں کے لاشے بے گور و کفن رہے۔ جب سر، نوکِ نیزہ پر بلند ہوئے تو ان سب کے سر بھی ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔

مولا حسینؑ سراپا مہر و محبت تھے ——————

ہم لوگوں سے ان کو دلی لگاؤ تھا۔ آپؑ نے بڑی کوشش کی کہ ہم لوگوں کو موت سے بچالیں اور قتل نہ ہونے دیں۔ مگر ہمارے ساتھی بھی بڑے باہمت اور بہادر تھے۔ انھوں نے بھی عزمِ مصمم کرلیا کہ جب تک زندہ ہیں

اپنے مولا پر کوئی آنچ نہ آنے دیں گے۔

اور کیوں نہ ہو ——————

یہ لوگ بڑے صاحبِ عقل وفہم تھے انھیں اپنی جانوں کی پرواہ نہ تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ انھیں بستر پر موت آئے۔ انھیں تو شرفِ شہادت حاصل کرنے کا شوق تھا۔

ان لوگوں کو معلوم تھا کہ ان کا بہا ہوا خون خشک اور ضائع نہیں ہوگا بلکہ رنگ لائے گا۔

وہ جانتے تھے کہ ——————

ظلم و ناانصافی، کفر و عصیاں، استبداد اور اللہ کی نافرمانی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے سے بہتر ہے کہ عزت کے ساتھ جان دے دی جائے۔

وہ لوگ مرنا چاہتے تھے ——————

لیکن اپنے بستر پر، اپنے خاندان اور اپنے دوست احباب کے حلقے میں رہتے ہوئے نہیں، بلکہ میدانِ جنگ میں، عالمِ مسافرت میں اور صحرائے لق و دق میں، مگر اس شان سے کہ ان کا سر حسینؑ کے زانو پر ہو اور ان کا ہاتھ حسینؑ کے ہاتھ میں ہو۔

جس روز بہشت کی جانب روانگی کا ارادہ ہوا تو موت کا رسم و رواج اور بہادری و شجاعت کا انداز بھی بدل گیا۔ حقیقت ہے کہ زیرِ سایہ بان اپنے کرم فرماؤں کی نوازشوں میں رہ کر مرنے سے زیادہ بیش قیمت وہ موت ہے جو تین دن کی پیاس میں ہو —— دھوپ میں ہو، تپتے ہوئے صحرا میں ہو، جنگ کرتے ہوئے ہو، نیز شمشیر کھاتے ہوئے ہو۔

ہمارے ساتھی بڑے جاں نثار تھے۔ وہ ظلم و زیادتی سے ٹکرانے میں ہر شے قربان کرنے پر آمادہ تھے ——

وہ اس پر آمادہ تھے کہ چاہے ہمارے سر تن سے جدا ہو جائیں مگر دامنِ اسلام تک ان خائنوں کا نجس ہاتھ نہ پہنچے۔

وہ اس کے لیے تیار تھے کہ خواہ ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں لیکن دشمن کو دینِ خدا سے گستاخی اور لاپروائی کا حق حاصل نہ ہو اور وہ اسلام کے خلاف کوئی نقشہ اور کوئی خاکہ نہ تیار کر سکے۔

یہ لوگ اپنے آقا حسینؑ کی رہبری کے زیرِ سایہ اپنے ان عزائم کو پورا کرنے کی کوشش کر رہے تھے، ان سے قدم ملا کر چل رہے تھے، ان کی ہدایات کو سنتے تھے۔ یہ بڑے مخلص، بڑے فداکار تھے، ان لوگوں نے وفاداری کا اعلیٰ ترین مظاہرہ کیا۔

جنگ کا آغاز و انجام

وہ جنگ جو روزِ سقیفہ بلکہ اس سے بھی پہلے روزِ بعثتِ سرورِ کائناتؐ سے جہالت و کفر و شرک کے خلاف شروع ہوئی تھی وہ کم و بیش ستر سال تک کبھی پنہاں اور کبھی آشکار جاری رہی ——

اس کا سلسلہ کربلا تک پہنچا اور یہاں مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان ظہور پذیر ہوئی۔

ایک گروہ یزید کے متبعین کا تھا جنھوں نے لباسِ شرک و کفر کو اتار کر مصلحتاً اسلام کا لباس اور وہ بھی یزیدی اسلام کا لباس پہن رکھا تھا۔

اور اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ محافظینِ قرآن، مدافعینِ رسالت،

پاکبازانِ راہِ اسلام اور مجاہدینِ راہ خدا کا تھا۔

بظاہر تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ——————

یہ جنگ صبح عاشور سے شروع ہو کر ——————

عصرِ عاشور تک ختم ہو گئی۔

یہ صرف چند گھنٹوں کی جنگ تھی مگر اسلام کی گزشتہ جنگوں سے اس کو کئی اعتبار سے ارجحیت اور فوقیت حاصل تھی۔ اس جنگ کو اگر جنگِ بدر کے بھی سامنے رکھ کر دیکھیے کہ جس میں رسولؐ کے مخلص اور باوفا اصحاب شریک تھے تو آپ کو بڑا فرق محسوس ہوگا۔

جنگِ بدر میں پیغمبر اسلامؐ نے اپنے اصحاب سے بار بار فتحیابی اور کامیابی کا وعدہ فرمایا —————— مگر کربلا کی جنگ میں امام حسینؑ مسلسل اپنے اصحاب کو موت اور شہادت کی خبر دیتے رہے۔

جنگِ بدر میں پانی جس پر زندگی کا سب سے زیادہ دارومدار ہے پاس ہی موجود تھا —————— مگر کربلا میں یہ پانی ہم لوگوں کے لیے عنقا اور نایاب تھا۔

جنگِ بدر میں اس قدر بے رحمی اور قساوتِ قلبی کا مظاہرہ نہیں تھا عورتوں اور بچوں کو حملوں کا نشانہ نہیں بنایا گیا ——————

مگر کربلا میں یہ سب کچھ ہوا۔

جنگِ بدر میں بھی مسائل اور مشکلات تھیں ——————

مگر اتنی بہرحال نہیں تھیں جتنی کربلا میں تھیں۔

جنگ بدر میں دونوں گروہ صاف صاف پہچانے جا رہے تھے۔ ایک کفر و شرک کا گروہ اور دوسرا اسلام کی پیروی کرنے والوں اور اللہ کی عبادت کرنے

والوں کا گروہ ——————

مگر کربلا میں دشمن ہمیں ملحد و کافر کہتا تھا اور خود کو مسلمان اور مومن بتاتا تھا اور ہم لوگوں کو بے محابا اور بے جھجک قتل کر رہا تھا اور وہ بھی قربۃً الی اللہ اسلام اور محمدؐ کے نام پر۔

بدر میں اسلام کی فوج کی تعداد کم تھی پھر بھی دشمن کی فوج کے مقابلہ میں ایک حد ہی تک کم تھی ——————

مگر کربلا میں ہم لوگ کل ۷۲ عدد تھے اور ادھر دشمن کی فوج کی تعداد اگر کم سے کم بھی مان لی جائے تو تیس ہزار (ورنہ لاکھوں) اور پھر ان ۷۲ میں بھی کچھ بچے، کچھ جوان، کچھ بوڑھے جن کے بال سفید ہو چکے تھے اور ادھر تیس ہزار کی فوج۔ ہر طرح سے مسلح، ہر طرح تیار اور اس کے پاس ہر طرح کا ساز و سامان۔

ان حالات میں ہم لوگوں نے صبح سے جنگ شروع کی تو اسے عصر تک مسلسل جاری رکھا۔ یہ بھی ایک کمال ہے۔ ورنہ شمر اور عمر سعد تو بار بار اپنی فوج کو خطاب کر کے کہتے کہ ——————

"ان لوگوں میں کیا رکھا ہے۔ یہ تو تمھارے لیے
ایک لقمہ ہیں"

(یعنی ایک حملہ میں سب ختم ہو جائیں گے۔)

لیکن واقعات اس کے برخلاف ظہور میں آئے۔ ہوا یہ کہ چونکہ ہمارے بہادر اللہ سے نصرت کے طالب تھے اور اس سے لَو لگائے ہوئے تھے اس لیے ان میں سے ہر ایک دشمن کے سَو فوجیوں کی برابری کر رہا تھا۔ اور ہمارے دشمن چونکہ مادی وسائل پر بھروسہ کیے ہوئے تھے اس لیے ان میں سے ہر ایک ہم لوگوں کے سامنے آتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا جیسے شیر کے سامنے کوئی لومڑی

آرہی ہے۔

بہرحال اسی طرح ہم لوگوں نے دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ چند گھنٹے جنگ رہی صبح سے ظہر تک اور پھر ظہر سے عصر تک۔

عصر کے وقت جنگ تمام ہوگئی۔

دشمن کی نظر میں تو اس کی مخالفت ختم ہوگئی مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اب اس کی مخالفت کا ایک نیا پروگرام شروع ہوگیا۔

یہ جنگ تو پیاس اور تشنگی سے شروع ہوئی اور خاک و خون پر جاکر ختم ہوگئی مگر کیا واقعتاً یہ یہاں ختم ہوگئی۔

ہم سب شہید ہوگئے

عصرِ عاشور تک ہم سب قتل ہوچکے تھے۔ اب کوئی باقی نہ تھا۔ نہ کوئی بچہ نہ کوئی جوان نہ کوئی بوڑھا نہ کوئی ادھیڑ عمر کا۔

ہمارے شہدا جنھوں نے سارے عالم کو زندگی اور حیاتِ تازہ عطا کی وہ دریائے فرات کے کنارے پیاسے شہید ہوگئے۔

حتیٰ کہ امام حسین علیہ السلام بھی جنھوں نے جنگِ صفین میں معاویہ کی فوج سے پانی کی نہر چھین لی اور پھر دوست دشمن سب کے لیے اس سے سیراب ہونے کی عام اجازت دیدی ——

یہ وہی حسینؑ ہیں کہ جنھوں نے ایک خشک سالی کے موقع پر مسلمانوں کے لیے نمازِ استسقار پڑھی اور اللہ تعالیٰ نے فوراً اپنی بارانِ رحمت سے سب کو سیراب کیا ——

یہ وہی حسینؑ ہیں کہ جنھوں نے حُرؑ کے پیاسے لشکر کو کربلا کے

قریب حالانکہ یہ لوگ آپؑ کا راستہ روکنے کے لیے آئے تھے مگر ان سب کو پانی پلایا لیکن افسوس خود پیاسے شہید ہو گئے ——————

ہمارے ساتھیوں نے انسانیت کے اعلیٰ مقاصد، اسلامی اقدار اور اپنے عقائد و افکار کے تحفظ کے لیے انتہائی بہادری اور کشادہ دلی کے ساتھ جان دی۔

اور جب ہم میں سے آخری فرد ——————

یعنی امام حسینؑ نے جان دی تو عاشور کا آفتاب مائل بغروب ہو گیا اور دشمن نے نعرہ بازی اور فتح کا جشن منانا شروع کر دیا۔

اب زخمیوں کی فریاد، افسروں کی ڈانٹ ڈپٹ، بہادروں کی رجز خوانیاں ختم تھیں —— میدانِ جنگ کا اڑتا ہوا غبار بیٹھ چکا تھا، گھوڑوں کی ہنہناہٹ موقوف تھی —— تلواریں نیام میں جا چکی تھیں، کمانیں دوش سے اتر چکی تھیں —— غرض دیکھنے میں ہر چیز ختم ہو چکی تھی۔

مگر اب ایک نئی چیز ابھرنی شروع ہوئی تھی اور وہ تھی ——

شہیدوں کے خون کا جوش !

شہیدوں کے خون کا ابال —— !

جنگ اور مقابلہ ختم ہو چکا۔ اب اس جنگ سے فائدہ اٹھانے کا وقت تھا۔ مار کاٹ کا قصہ تمام ہوا۔ اب تو ان متضاد افکار کے تصادم کے نتائج ظاہر ہونے شروع ہو چکے تھے۔

شہیدوں نے تو اپنا پیغام پہنچا دیا۔ اب یہ زندہ لوگوں کا کام تھا کہ اس پیغام سے فائدہ اٹھائیں یا خاموش بیٹھے رہ جائیں۔

ہم لوگوں کے لاشے تو کربلا کے ریتلے میدان میں پڑے رہ گئے اور

ہمارے سر، حاکمِ کوفہ اور اس کی عمّال کی بہترین کارکردگی اور کارگزاری دکھانے کے لیے مختلف شہروں اور قصبوں سے ہوتے ہوئے بطورِ تحفہ شام پہنچے۔ مگر ان ہی سروں کے ساتھ رسولِ اسلام کا پیغام پہنچانے والے اور ہم لوگوں کے کاموں کی تکمیل کرنے والے یعنی کربلا کے قیدی اور خاندانِ رسالتؐ کے افراد بھی روانہ ہوئے اور ان لوگوں نے ایسا راستہ اختیار کیا جو ہمیشہ کے لیے کھل گیا۔

کچھ اپنے عزاداروں سے

کچھ اپنے عزاداروں سے

ہم لوگوں کی شہادت اتنی پُرتاثیر ہے کہ جس کو سُن کر ہر انسان متاثر ہوگا اور ہر ایک ہم پر ترس کھائے گا۔

اور آج جو تم لوگ ہم پر روتے ہو تو شاید اس لیے کہ تم لوگوں کو ہم پر رحم آتا ہے۔ شاید اس لیے کہ ہم پر ترس کھاتے ہو۔ شاید اس لیے کہ ہم پر طرح طرح کی مصیبتیں ٹوٹیں۔

مگر ہم تم لوگوں کو بتا دیں کہ _____

تمھارا یہ گریہ اور تمھارے یہ آنسو تمھاری عقدہ کشائی تو کر سکتے ہیں لیکن کسی درد کی دوا نہیں بن سکتے۔

اصولی طور پر تو اسلام اس امر کا عادی نہیں کہ کسی مُردہ پر پرمسرت چہرے کے ساتھ رویا جائے۔ مگر صرف ان وجوہ کے پیش نظر ہم لوگوں پر

نہیں رونا چاہیئے۔ ہم لوگ کوئی ایسے لاچار اور درماندہ مردے نہیں تھے جو مستحق گریہ ہوں ——

اگر تمھیں رونا ہی ہے تو کسی ایسے مردہ پر رویا کرو جو واقعاً لاچار اور درماندہ رہا ہو۔ ہم لوگوں نے تو بحمداللہ اپنی جانبازی سے ظلم واستبداد کے قوی دیو کو زمین پر پچھاڑ دیا۔ مُردہ دلوں میں جان ڈالی، زمانے کے دیو اور درندوں پر فتح پائی۔ ایسی صورت میں کیا ہم پر رونا مناسب ہے ؟

ہرگز نہیں .....!

اسلام شہدائے راہ خدا پر رونے کی تاکید کرتا ہے۔ اس لیے کہ شہید شجاعت پرور ہے اور اس پر رونا، اس کی شجاعت میں شرکت کے مترادف ہے۔

خود پیغمبرِ اسلام، حضرت حمزہ سید الشہدار کے لیے مکّہ سے کسی کو اپنے ساتھ نہیں لائے تھے جو ان کے سوگ میں بیٹھے اور ان کے غم میں روئے مگر آپؐ نے خواہش کی کہ چند مسلمان مرد اور عورتیں ان کے گھر میں جا کر بیٹھیں اور ان کے احترام میں ان پر گریہ کریں۔

کسی شہید پر رونا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

یہ رونا اس امر کی دلیل ہے کہ ہمیں اس ظالم سے نفرت ہے جس نے اس کو شہید کیا۔ یہ گریہ اپنے دلی رنج کا اظہار ہے۔ یہ گریہ اس امر کی علامت ہے کہ آپ کو ظالم سے نفرت اور مظلوم سے پیار و ہمدردی ہے۔ اس نظر سے اگر دیکھا جائے تو امام حسینؑ اور دیگر شہیدوں پر رونا ایک مستحسن امر ہے۔

ان تمام گفتگوؤں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم پر ہر مرتبہ رونے سے پہلے ہمیں پہچانا جائے۔

اے ہمارے عزادارو!

تم لوگ صرف ہم لوگوں پر گریہ کر کے اجر و ثواب کے خواہشمند نہ بنو۔ بلکہ ہمارے راستے پر چل کر اور اسلام کے صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہ کر بھی حصول ثواب کی کوشش کرو۔ ہم لوگوں نے جو کچھ کیا اس پر غور کرو اور سوچو کہ ہم لوگ کیوں قتل ہوئے۔ ہم لوگوں کے اندر حق پرستی اور نصرتِ حق کا جذبہ کس قدر تھا اور اس کا اظہار ہم لوگوں نے کس طرح کیا۔

ہم لوگوں نے اپنے مقصد کی راہ میں کیا کیا رجز خوانیاں کیں کیا کیا بہادری اور شجاعت دکھائی اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے کون سا راستہ اختیار کیا۔

جب تم لوگ یہ تمام باتیں سوچنے لگو گے تو یقین ہے ایک طرف تمھارے لبوں پر مسکراہٹ ہو گی اور دوسری طرف تمھاری آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرات ہوں گے

لبوں پر مسکراہٹ اس لیے ہو گی کہ ——————

تم میں سربلندی اور غرور کا احساس ہو گا اور تم اس پر خوش ہو گے کہ اسلام اپنے اندر تربیت کا کتنا عظیم پروگرام اور لائحہ عمل رکھتا ہے کہ جس میں وہ ایسے ایسے صاحبانِ اخلاص جانبازوں کی پرورش کرتا ہے۔

تمھیں محسوس ہو گا کہ فتنہ و فساد اور دنیا پرستی کے دور میں بھی ایسے ایسے اپنی جان کی قربانی دینے والے پیدا ہوتے ہیں جو اپنے مقصد کے حصول کی راہ میں کسی شے کی پرواہ نہیں کرتے۔

آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرات اس لیے ہوں گے کہ ——————

تم اس دلخراش منظر کو سنو گے کہ دشمنوں نے ہم لوگوں پر کیسے کیسے ظلم و ستم ڈھائے۔ اور تمھیں معلوم ہو گا کہ بنی امیہ کے جنایت کاروں اور سیہ کاروں نے چند درہم و دینار کے حصول کے لیے کیسی کیسی درندگی دکھائی۔ کس کس

طرح ہم لوگوں کو قتل کیا اور ہمارا خون بہایا۔

ہم پر رونے والو سنو!

صرف از راہ ترحم اور ترس کھا کر ہم لوگوں پر مت روؤ، اور صرف رونے کے لیے ہمارے مزار کی تلاش میں نہ نکلو۔ سنو! ہم لوگ سب کے سب، ایک سرزمین پر، ایک ساتھ، ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو، ایک ہی رنگ کے کفن میں، بڑے آرام سے لیٹے ہوئے ہیں۔

لیکن ہماری نگاہیں تم لوگوں پر اور تمھاری آئندہ نسلوں پر ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم لوگ اپنی سہل انگاری کے سبب کسی تلاطم و طوفان کے شکار ہو جاؤ ——— !

ہمیں تم لوگوں کا گریہ پسند ہے، اس سے تمھارے اندر ہماری پیروی کے پاک احساسات و جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اور تم لوگوں کے بغرضِ زیارت ہماری قبروں پر آنے سے بھی خوش ہیں۔ اس لیے کہ اس زیارت سے تمھیں راہ حق میں جانبازی اور فداکاری کا سبق ملتا ہے۔

مکتبِ کربلا

ہم لوگ دنیا سے تو چلے گئے مگر تم لوگوں کے لیے ایک درس گاہ قائم کر گئے۔ جو تا قیامت قائم رہے گی۔ ایک کتابِ معرفت کھول گئے جو تا قیامت کھلی رہے گی۔ یہ ایسی درس گاہ ہے جس میں مقصد کی حفاظت، فداکاری، ایثار اور بہادری کا سبق ملتا ہے۔

اس درس گاہ میں انسان کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ ———

قرآنی تعلیم کو قائم رکھنے کے لیے اپنی جان کیونکر دی جائے۔

اور شجرِ اسلام کو سرسبز و شاداب و تناور رکھنے کے لیے کس طرح جہاد کیا جائے۔
یہ درس گاہ کہتی ہے کہ ——————

اگر ضرورت پڑ جائے تو اپنی گردن بھی زیرِ تیغ رکھ دی جائے
تاکہ دنیا سے قتل و غارت و جرم و عصیان کا خاتمہ ہو جائے۔ اور دنیا کے درماندہ و افسردہ لوگوں کے زرد و لاغر چہروں پر سُرخی دوڑانے کے لیے اگر ضروری ہو تو اپنا خون بہا دیا جائے۔

کربلا کی درس گاہ، انبیاء کی درس گاہ ہے ——

مصلحین و مجاہدین اور ہمیشہ زندہ رہنے والوں کی درسگاہ ہے —— یہ مکتبِ معرفت ہے —— مکتبِ عشق و محبت ہے —— مکتبِ عدالت طلبی ہے ——————

یہ ظلم و جور کے خلاف جنگ ہے —— اسلام سے منحرف ہونے والوں کے مقابلہ میں جہاد ہے ——————

کربلا مکتبِ حریّت و آزادی ہے —— مکتبِ حق پرستی ہے —— مکتبِ اہلِ صفا ہے۔

اس مکتب میں یہ سبق دیا جاتا ہے کہ ظلم و ستم کو کبھی قبول اور برداشت نہ کرو۔ جان دے دو مگر آہ نہ کرو۔

مگر سب سے اہم کام تو یہ ہے کہ اس مکتب سے سبق لیا جائے اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

ہم شہیدوں کے یہ چند خطابات

ہمارے یہ خطابات تم لوگوں سے ہیں اس لیے کہ تم انسان ہو، فرائض و

ذمہ داریوں کو سمجھتے ——— اپنی شرعی تکلیف اور تقاضائے دین سے آگاہ ہو
اس لیے ———
ہمارا یہ خطاب تم پیروں، جوانوں، عورتوں، مردوں
اور بچّوں سے بلکہ ہر اس شخص سے ہے جو انسان ہے۔

اے روشن دماغ اور فرض شناس لوگو!

ہم لوگوں نے اپنا خون اسلام کے لیے اس لیے بہایا کہ تمھارے خون میں سُرخی آئے۔ ہم لوگوں نے ہر مصیبت اور عدم کی تاریکی کو اس لیے قبول کیا تاکہ تمھاری راہ روشن ہو جائے۔ ہم نے اپنی جان کو شعلوں کی مانند فضا میں بلند کر دیا تاکہ اس سے تمھارے آسمانوں میں اُجالا پھیلے۔

اب اگر اس کے بعد بھی تم لوگوں پر تباہی آئے تو تم لوگوں پر افسوس ہے۔ اگر کوئی تم پر ظلم و ستم کرے تو تمھارے حال پر رونا چاہیے۔

خود اپنے پر، اپنی قوم پر، اپنے فرائض اور ذمہ داریوں پر نظر رکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ تمھارے ذہنوں سے جہاد کا تصور بھی مٹا دیں۔ اور تمھاری قوی اور توانا روح کو تم سے چھین لیں۔

اے اسلام کے محافظو!

ہم لوگ اسلام اور اس کے دفاع کی خاطر گھوڑے کی ٹاپوں کے نیچے پامال ہوئے۔ توہین آمیز باتیں سنیں۔ اپنی بے حرمتی برداشت کی۔ دشمن کی قید میں گئے تاکہ اسلام کو ظالموں کے پنجے سے رہائی دلائیں۔ خود کو موت کے حوالے کیا تاکہ اسلام ایک نئی زندگی پائے۔

ہم لوگوں نے زبان ، تلوار، ہاتھ ، پنجے اور دانتوں تک سے اسلام کا دفاع کیا بلکہ اپنے خون کا آخری قطرہ بھی اس کے لیے بہا دیا اور اپنا سارا سرمایۂ وجود اس پر نچھاور کر دیا اور کسی حال میں بھی آپس میں اتفاق و اتحاد و یگانگی اور وحدتِ کلمہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ۔ اور لوگوں کی نیش زنی ، بے توجہی ، عدم دل چسپی کی فکر نہیں کی ۔

اے طالبانِ سروسامان

ہم لوگوں نے اسلام کے وقار اور اس کی عزت و حرمت کی خاطر اور قرآن و اسلام کے ناموس کی بقا کی خاطر شہادت قبول کی ۔ اور کوشش کی کہ ہمارے اجساد اسلام پر نچھاور ہو جائیں اور ہماری روحیں بلندیاں حاصل کریں ۔

ہم لوگوں نے اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھویا تاکہ دوسروں کو زندہ رہنے کا حق دلائیں ۔ ہم لوگوں نے اپنی آرزوؤں کو خاک میں ملایا تاکہ اسلام کی آرزوئیں پوری ہوں ۔

ہمارے ساتھی پیاسے رہے تاکہ عالمِ بشریت سیراب ہو ۔ انھوں نے اپنے خون کے دریا بہا دیے تاکہ تمھارے دریاؤں میں آبِ حیات جاری ہو ۔ ہر طرح کی محرومیت گوارا کی تاکہ انسانیت کو محرومیت نہ دیکھنی پڑے ۔

لہٰذا اس کے بعد اب تمھاری زندگی ——————

حق و انصاف کی بنیادوں پر استوار ہونی چاہیے

تقویٰ ، پرہیزگاری اور شرافت کی راہ پر چلنی چاہیے —— تم لوگ اپنے مقصد کو پیشِ نظر رکھو اور ہر وہ چیز جو حق کے خلاف ہے اس سے دور رہو ۔ نہ دنیا میں ظالم بن کر رہو نہ مظلوم بن کر ۔

اے قوم کے ماں باپ

ہم نے اپنے گھر اور اپنے خیمے تک جلوا دیے تاکہ تمھارے گھر آباد ہوں۔ ہمارا خاندان خاک نشین ہوگیا تاکہ تم لوگ صدر نشین بنو۔ ہمارے بچے ایک گھونٹ پانی کو ترسے تاکہ تمھارے بچے محروم و مایوس نہ رہیں۔ ہمارے گھر والوں نے بھوک پیاس اور قید و بند و اسیری برداشت کی تاکہ تم لوگ بھوکے پیاسے اور بے سروسامانی کی زندگی بسر نہ کرو۔

لہٰذا ہم لوگوں نے تمھارے لیے جو نمونے اور کردار پیش کیے ہیں، اس کی حفاظت کرو اور کوشش کرو کہ وہ کردار اور وہ نمونہ تم سے دُور نہ ہو جائے۔

اے جوانانِ امّت

اپنی سوچ کو صحیح اور درست رکھو اور کوشش کرو کہ تمھاری زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھلی رہے۔ لغویات اور حشویات میں اپنی عمر تلف نہ کرو۔ غلط اور خام خیالات کو اپنے دل میں جگہ نہ دو۔

آخر ہمارے جوانوں کو دیکھو کہ وہ خدمتِ اسلام کی راہوں میں کتنے ثابت قدم، باوفا، بامقصد اور با اخلاص تھے۔

انھوں نے اسلامی اصولوں کی حفاظت میں جان سے ہاتھ دھوئے۔ اسلام کو زندہ رکھنے کے لیے خود موت کے منہ میں چلے گئے اور عالمِ تشنگی میں جان دے دی۔

اے بزرگانِ ملّت

اے وہ لوگو جو اسلام کی آبرو اور قوم و ملّت کے لیے ذخیرہ ہو، ذرا ہمارے حبیب ابن مظاہر پر نظر ڈالو۔ ذرا ہمارے مسلم بن عوسجہ کو دیکھو کہ انھوں نے کس کس طرح اپنے نظریہ اور اصولوں کی حفاظت کی اور اپنے فریضہ کی انجام دہی میں کس طرح جان دے دی۔

ان لوگوں نے اپنے عمل سے بتادیا کہ بڑھاپے اور کہن سالگی کو خانہ نشینی کا عذر نہیں بنایا جا سکتا۔ اور عمر رسیدگی فریضہ اور ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں کر سکتی۔

بوڑھوں پر بھی کچھ ذمہ داری ہے اور بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ جوانوں کی رہنمائی کریں اور اپنے تجربوں سے انھیں فائدہ پہنچائیں۔

اے عورتو اور اے بیویو

تم ذرا ہماری عورتوں اور ہماری بیویوں کو دیکھو کہ انھوں نے حصولِ شہادت کا ہمیں کس کس طرح شوق دلایا۔

ان میں سے تو اکثر ایسی تھیں جنھوں نے میدانِ جنگ میں جانے کے لیے اپنے مردوں کو خود ابھارا، آمادہ کیا اور ان کی ہمت بڑھائی۔ اور بہت سی ماؤں نے اپنے بچوں کو اپنے ہاتھ سے کفن پہنا کر میدان میں بھیجا۔

یہ ہماری راہ میں حائل نہیں ہوئیں اور ہماری شہادت کی راہ میں اپنی محبت کو رکاوٹ نہیں بننے دیا۔

کربلا کے واقعہ سے پہلے ان خواتین کے پاس بھی گھر تھے،

لباس تھے ، زیورات تھے ۔ شوہر اور بچے تھے ۔ اپنے پڑوسیوں اپنے یگانوں اور اپنے بیگانوں سے میل جول و آمد و رفت تھی ۔ ان کو بھی اپنے شوہروں سے بڑی عقیدت اور بڑی محبّت تھی ۔

مگر ان بے چاریوں نے اسیری قبول کی ، قید خانے میں رہنا گوارا کیا تاکہ تم لوگوں کے یہ نرم نرم بستر سلامت رہیں ۔ شامِ غریباں کی تاریکی جھیل لی تاکہ تمھاری بزم میں روشنی رہے ۔

لہٰذا حفاظتِ حق کے لیے اپنے شوہروں کے ارادوں کو متزلزل نہ کرو ۔ ان کے روحانی سکون کو برہم نہ کرو ۔

اے بچّو اور اے جوانو

ہمارے بچّوں نے ہمیں، ہمارے مقصد سے روکنے کے لیے کبھی اپنی کمسنی کو بہانہ بننے نہیں دیا ۔ شہادت سے باز رکھنے کے لیے کبھی ہمارے ہاتھ پاؤں کی ہتھکڑی اور بیڑی نہیں بنے ۔

ہمارے دشمنوں سے کبھی امان اور پناہ نہیں چاہی ۔ ان کی روٹیاں اور ان کے خرمے نہیں کھائے ۔ دشمن کے ہاتھ پاؤں کو بوسے نہیں دیے بلکہ ہمیشہ ان سے نفرت کا اظہار کرتے رہے ۔ اپنے آنسوؤں کو ان سے چھپایا تاکہ مبادا دشمن اس کا کچھ اور مطلب نکالے ۔

ہمارے بچّے کانٹوں پر سوئے ، زمین پر سوئے ، ہماری لاشوں پر روئے ۔ پیاس دیکھی، بھوک برداشت کی اور یہ سب اس لیے تاکہ اپنے مقصد کے حصول میں ہمارے قدموں کو لغزش نہ ہو ۔ ہم سُست نہ پڑ جائیں ۔

اللہ تمھارے والدین کو تمھارے سروں پر قائم رکھے اور تمھیں کسبِ کمال کی توفیق عطا کرے ۔ تمھیں تمھاری محنتوں کا اچھا پھل دے اور تم اپنی زندگیوں سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤ۔

اور اب آخر میں اے انسانو

اے عالمِ بشریت اور وہ لوگو جو دنیا کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک زندگی بسر کر رہے ہو، غفلت چھوڑو، اپنے آپے میں آؤ ۔ ہمیں یاد کرو ۔ ہم لوگوں کے مقصد کو اپنے پیشِ نظر رکھو اور دیکھو کہ ہم لوگ کون تھے ۔

ہم کیوں اٹھے ـــــ اور ـــــ کس مقصد کے لیے قتل ہوئے ـــــــ ؟ ہم لوگوں نے اسلام کی بقا اور اس کے شرف کے لیے، تمھاری اور تمھاری آزادی کی حفاظت کے لیے، انسانیت کی اقدار کی بزرگداشت کے لیے موت کا سامنا کیا ۔ تمھاری عزت و آبرو بچانے کے لیے جنگ کی ۔ قرآنی احکام کی حفاظت کے لیے معرکہ آرا ہوئے ۔

ہمارے گھر، گھر والوں سے خالی ہو گئے، ہماری آبادیاں ویران ہو گئیں، ہم جان اور مال بلکہ ہر طرح سے لٹ گئے ۔ نیزوں اور شمشیروں نے ہماری جمعیت کو متفرق اور منتشر کر دیا۔

معلوم ہے یہ سب کس لیے ـــــــــــــــ

یہ صرف تمھارے گھروں کو آباد رکھنے کے لیے، تمھارے امن و امان کے لیے، دشمن کی دست درازی اور غارت گری سے تمھیں اور تمھاری زندگی کو بچانے کے لیے، اسلامی اصولوں کی حفاظت کے لیے، شجرِ اسلام کی سیرابی اور شادابی کے لیے اور انسانی قدروں کو پامالی سے بچانے کے لیے۔

ہم لوگ تمھیں بھولے نہیں تھے ، کوشش کی تھی کہ تمھاری زندگیوں
کو شر و فساد سے پاک کر دیں ——— تمھارے لیے آزاد اور قانونی
زندگی تلاش کریں۔

اب یہ تمھارا فرض ہے کہ ———

تم اپنی زندگیوں کو انسانیت کے سانچے میں ڈھالو۔
انسانیت کی حفاظت کرو ۔ ہمیں اور ہمارے مقصد کو یاد رکھو۔
ہمارے مصائب پر دھیان دو ———
ہمارے نصب العین کو زندہ رکھو اور اس کی حفاظت کرو۔
اور کوشش کرو کہ ہم لوگوں کا خون ضائع اور برباد نہ جائے۔
اسلام کا پرچم ہمیشہ بلند اور سایہ فگن رہے ———
معاشرے اور اجتماعی زندگی میں عدل و انصاف برقرار رہے ۔
اے آئندہ آنے والے انسانو!
تم ہمارے نظریہ کے وارث بنو ———
——— ہمارے اصولِ زندگی اور ہمارے مکتبِ فکر کی حفاظت کرو۔
قرآن کی شمع ہدایت کو بجھنے نہ دو ———
ایسا نہ ہو کہ ———
برائیاں اور بدیاں سارے عالم پر چھا جائیں۔
تم صرف اپنی ہی نہیں بلکہ پورے انسانی معاشرہ کی فکر کرو۔ تمھاری
کوشش یہ ہونی چاہیے کہ دوسروں کے لیے بھی چراغ روشن کر کے راستہ
میں رکھ دو تاکہ وہ اس کی روشنی میں راستہ دیکھ کر چلیں ———
اور کسی کنوئیں میں نہ گر جائیں۔

ہماری یہ جنگ بالکل پہلی یا بالکل آخری جنگ نہیں ——
اس سے پہلے بھی جنگیں ہو چکی ہیں —— اور اس کے
بعد بھی حق و باطل کے درمیان جنگ ہو گی۔
ہم لوگوں کا راستہ تو ایک نمونہ اور سرمشق ہے ——
ہر اس شخص کے لیے جو چاہتا ہے کہ کام کو آگے بڑھائے
مگر صلح و آشتی کے ذریعہ۔ اگر اس کے بڑھنے کا امکان نظر نہیں آتا تو آخر
وہ کیا کرے، یہی تو کرے گا جو ہم نے کیا۔
شہیدوں کا خون مسلسل جوش میں ہے ——————
اور ——
اللہ ان شہیدوں کی سنت کو برقرار رکھے یہ اس وقت
تک جوش کھاتا رہے گا جب تک ظالموں اور ستم گاروں کے خون کو پانی کی
طرح نہ بہا دے اور انھیں ——
نیست و نابود نہ کر دے!

اے انسانو! تم سے ہمیں یہی اُمید ہے!

والسلام

آسان مسائل

تصنیف :-
حجۃ الاسلام حاج
شیخ محمد وحیدی دامت برکاتہ

اردو ترجمہ
ترتیب، تہذیب و اضافات :
بیگم ط۔ سیدہ

خواتین سے متعلق مخصوص مسائل پر مشتمل، جامع ، منظم اور منفرد کتاب جس میں ان مسائل کو صراحت کے ساتھ نہایت آسان پیرائے میں پیش کیا گیا ہے ۔

دیدہ زیب سرورق ۔ سفید کاغذ ۔ آفسٹ طباعت ۔ ۱۴۶ صفحات ۔ قیمت صرف ۲۰ روپے

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان
۲۔ جے ۔ ۵/۲ ۔ ناظم آباد نمبر ۲ ۔ کراچی

دار الثقافة الإسلامية

١٤٠٣هـ

كراچي پاكستان

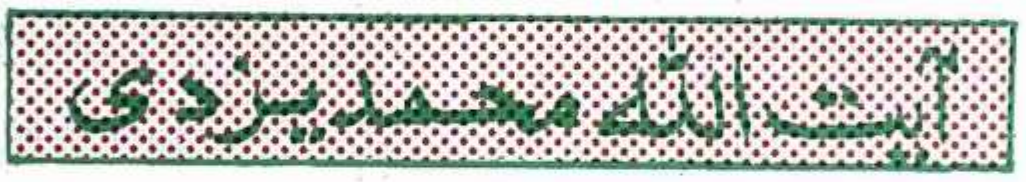

دلنشیں پیرائے میں مستند کتاب

حسینؑ شناسی

آیت اللہ محمد یزدی

کتاب ہذا میں واقعہ کربلا کے حقیقی عوامل و اسباب بیان کرتے ہوئے ان حالات میں امامؑ کے لائحہ عمل پر بحث کی ہے اور اس دور کی سیاست اور امامؑ کے لائحہ عمل کو آسان عام فہم اور جدید اصطلاحات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے

دیدہ زیب سرورق | عمدہ کتابت | بہترین طباعت | سفید کاغذ | قیمت ۲۵ روپے